ضمیر الدین احمد

سوکھے ساون

افسانے

ضمیر الدین احمد

دانیال

اشاعت اوّل	:	اپریل ۱۹۹۱ء
تعداد	:	۱۰۰۰
قیمت	:	۱۲۰ روپے
کتابت	:	مظفر گجراتی
سرورق	:	آصف جمیل
ناشر	:	حوری نورانی

مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز ۲
عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

طابع : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ اردو بازار کراچی

سادی ضمیر

کے نام

آپ سے

باون سے لکھ رہا ہوں مگر بیچ میں لگاتار پندرہ برس چپ سادھے رہا۔ ۱۹۹۰ء ابھی تک کوئی چالیس افسانے لکھے ہیں۔ جن میں سے بارہ اس مجموعے میں شامل ہیں۔ اردو میں یہ میرا پہلا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ایک انتخاب دیوناگری رسم الخط میں دہلی سے چھپ چکا ہے۔

عورتیں۔ لڑکیاں یا بچیاں اِن ساری کہانیوں کی مرکزی یا اہم کردار ہیں۔ ایک افسانے کا عنوان بدلا ہے۔ ”پچھم سے چلی پردا“ پہلے بہ عنوان ”پردائی“ چھپا تھا۔

دو تین افسانوں میں بعض کرداروں اور مقامات کے نام بدل دیئے ہیں۔ چند میں اپنی اور کاتب حضرات کی غلطیاں درست کی ہیں۔ اور دو ایک میں ایک آدھ لفظ یا فقرہ قلم زد کیا ہے۔

جو آرا گرد پوش پہ یا افسانوں کے ساتھ نقل کی گئی ہیں اُن میں سے ایک بھی فرمائشی نہیں۔ چونکہ بیشتر کا اظہار نجی طور پہ۔ یعنی خطوط میں یا گفتگو کے دوران میں کیا گیا تھا اس لئے رائے دینے والے حضرات سے لکھ کر یا زبانی پوچھ لیا گیا کہ بھائی آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔ اِن میں سے کچھ نہ تو نقاد ہیں نہ ادب کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ مگر میں اُن کی رائے کی قدر کرتا ہوں۔ اس کے برخلاف بعض ایسے حضرات کی توصیفی آراء۔ جو صرف یا بیشتر تنقید کے حوالے سے معروف ہیں۔ شامل نہیں کی ہیں۔ کیوں کہ میری نظر میں اُن کی ادبی نیت مشکوک ہے۔

ضمیرالدین احمد۔ لندن

سوکھے ساون

لندن۔ ۱۹۸۷ء

شعور۔	ساریکا (ہندی)	محراب۔	نیا دور۔
دہلی	دہلی	لاہور	کراچی

"سوکھے ساون" یقیناً ایک زندہ رہنے والی کہانی ہے جس کی تکنیک بالکل اچھوتی ہے۔ آپ نے کمال کا افسانہ لکھا ہے۔

جمیل جالبی

"سوکھے ساون" پڑھ کر تڑپ اُٹھا۔ خدا نے آپ کو متوسط طبقے کے مسلمان مرد عورت کی رُوح سے وہ آشنائی عطا کی ہے کہ بس۔ اور آپ کا افسانہ پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ UNDERSTATED ہو گیا ہے۔ دل سے بے اختیار آفرین نکلتی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

اس کہانی سے اُردو افسانے کا احیاء ہوتا ہے۔

بلراج مین را

"سوکھے ساون" لاجواب ہے۔ طبیعت خوش ہو گئی۔ ... "تشنۂ فریاد" بھی من کو بھائی۔ لیکن ظاہر ہے "سوکھے ساون" چیزے دیگر است۔

محمد عمر میمن

"تشنۂ فریاد" میں ایک نوجوان لڑکے کی رپورٹنگ جس طرح کہانی کے اساسی رمز کے اظہار کا بہانہ بنتی ہے۔ یا "سوکھے ساون" میں بیٹی اور داماد کے بستر کی سلوٹیں۔ ادھیڑ عمر کو پہنچی ہوئی ماں تک اس کی اپنی تشنہ کام رُوح کا جو سندیسہ لے آتی ہیں وہ بہت اسرار آمیز ہے۔ اُن کے واسطے سے ہم جسم اور ارض کی بنیادی صداقتوں اور انسانی وجود میں مخفی شر کے بعض عناصر سے بھی روشناس ہوتے ہیں۔

"تشنۂ فریاد" میں کانچ کی چوڑیوں اور زمین پر بکھرے پتوں۔ یا "سوکھے ساون" میں سائیں بابا کے دیوانہ وار نعروں۔ یا پہلے تو کچے فرش پر گرتی بوندوں۔ بادلوں کو چاک کر کے چمکتی ہوئی بجلیوں اور پھر بے آواز برستی بارشوں کے علامتی بیان سے۔ اِن کہانیوں کی معنویت بیک وقت کئی سطحوں پر اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے۔

شمیم حنفی

اور جب اُسے محسوس ہوا کہ شرم کے مارے اس کا ماتھا بھیگ چلا ہے تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے ماتھے پہ ہاتھ پھیرا ــــــ ماتھا خشک تھا۔

کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا اور ادھ کھلے دروازے میں سے دالان اُسے دھوپ سے بھرا نظر آیا ــــــ وہ ہڑ بڑا کر اُٹھا چاہتی تھی کہ اُسے یاد آیا: ارے، آج تو اتوار ہے ــــــ اس نے لیٹے ہی لیٹے انگڑائی لی، پھر ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کی کنڈی کھول دی ــــــ اس کے منہ پہ لو کا ایک تھپیڑا پڑا ــــــ سنسان گلی میں دھوپ ننگی ہو کر ناچ رہی تھی۔

اس نے کھڑکی بند کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سامنے کے گھر کا دروازہ کھلا اور جامع مسجد کے پیش امام صاحب اُٹنگے پاجامے اور گاڑھے کے کرتے میں ملبوس اور گاڑھے ہی کی گول ٹوپی پہ بے بالوں کی تولیہ ڈالے، جو اُن کی گردن کی پشت اور کنپٹیوں کو بھی ڈھانکے ہوئے تھی اور جس کے دو کنارے انھوں نے اپنے دانتوں کے بیچ دبا رکھے تھے، باہر آئے اور گلی کے موڑ کی طرف بڑھ گئے۔

ظہر پڑھانے جا رہے ہوں گے ــــــ اس نے کھڑکی بند کرتے ہوئے سوچا۔

اتنی دیر ہوگئی ـــــ اُس نے کروٹ بدل کر ٹائم پیس پر نظر ڈالی جو سرہانے کے پاس ایک تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔

ساڑھے گیارہ.... زیادہ دیر تو نہیں ہوئی، پھر بھی اب اٹھنا چاہیئے ـــــ مگر وہ اٹھی نہیں۔ بلکہ چت ہوکر بیک وقت چھت کی دھنیاں گننے اور اپنے آپ سے یہ سوال کرنے لگی کہ وہ اتنی گرمی میں رات کو آنگن کی بجائے کمرے میں کیوں سوئی۔

اسٹیشن سے لوٹتے لوٹتے کوئی دو بج گئے تھے ..... آنگن میں سوتی تو نیند خراب ہوتی کہ صبح ہی صبح سورج کی کرنیں آنکھوں میں گھس جاتیں....

اور پھر آج جلدی اٹھنا بھی نہ تھا، اس لئے ـــــ ادھر اسے جواب ملا اور اُدھر اس کی نظریں چھتی اور آخری دھنّی پر سے ہٹ کر اس ٹانگ پر پڑیں جس پر سے سوتے میں غرارے کا پائنچہ ہٹ گیا تھا اور جس کی گیہوں رنگت کی سڈول پنڈلی پر یہاں وہاں کالے بال بڑھ آئے تھے۔

اس نے پنڈلی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا، پھر پائنچے کو تھوڑا سا اور اوپر کھسکایا ـــــ ران صاف تھی۔

اس نے دوسرے پائنچے کو بھی اسی قدر اوپر کھسکایا ـــــ دوسری پنڈلی پر بھی بال بڑھ آئے تھے مگر ران دوسری بھی صاف تھی۔

اس نے جلدی سے پائنچوں سے دونوں رانوں اور پنڈلیوں کو ٹخنوں تک ڈھانکا، جیسے شادی سے پہلے اپنے باپ کی موجودگی میں وہ جلدی سے دوپٹے سے سر اور سینہ ڈھانک لیا کرتی تھی۔

بنانا چاہئیں ـــــ اور اوندھی ہوکر اس نے ٹانگیں پھیلا دیں۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

بُوا کھول دیں گی ـــــ پھر دستک ہوئی اور اسے یاد آیا کہ بُوا تو کل شام

چھٹی لے کر گئی تھیں۔

وہ جلدی سے اُٹھی، پیر چپّل میں ڈالے، دروازے کی طرف بڑھی، واپس آئی، سرہانے سے اُٹھا کر دوپٹہ گلے میں ڈالا۔ تپتا پکا دالان اور اس سے بھی زیادہ تپتا کچا آنگن پار کر کے باہر کے دروازے پر پہنچی۔ کواڑ کی ایک چوڑی درز میں سے جھانک کر دیکھا اور پھر کُنڈی کھول دی۔

بائیں کولھے پر ٹوکری رکھے، جس میں سے بانس کی جھاڑو کی موٹھ جھانک رہی تھی، مہترانی اندر آئی اور "سلام بی بی جی" کہہ کر پاخانے میں گھس گئی۔

اس نے سلام کا جواب سلام سے دیا اور کواڑ بھیڑ کر باورچی خانے میں چلی گئی اور اسٹوو پر چائے بنانے لگی۔

"سنو دلاری!" اس نے وہیں سے آواز دی۔

"جی بی بی جی!" مہترانی نے بھی وہیں سے جواب دیا۔

"ونائل سے دھونا۔"

"اچھا بی بی جی۔"

واقعی دُلاری رہی ہوگی...! بالکل اسم بامسمیٰ....! رنگت ابھی تک کیسی صاف ہے.... اور آنکھیں ہزاروں میں ایک۔ کسی طرف سے بھنگن نہیں لگتی.... وہ کہتے تھے کہ امان آباد کے کوئی سیّد تھے، ان کا نطفہ ہے ——— وہ مسکرائی۔ جب انھوں نے بتایا تھا کہ دُلاری کا نام پلیٹ فارم بھی ہے تو ہنسی کے مارے اس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔

محلّے کا جو بھی لڑکا بالغ ہوتا تھا، پہلے اسی پہ ہاتھ صاف کرتا تھا، جیسے چھوٹے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں پہ ہر کوئی بغیر ٹکٹ کے چلا آتا ہے... نہیں، ہنسی کے مارے بُرا حال تو میرا اس لیے ہوا تھا کہ انھوں نے گدگدی کی تھی، اور گدگدی

انھوں نے اس لئے کی تھی کہ میں نے شرارت سے پوچھا تھا، کیا آپ نے بھی چہل قدمی کی تھی پلیٹ فارم پر.... ہائے کتنی گدگدی کیا کرتے تھے۔

"رام دُلاری!"

"جی بی بی جی!"

"چائے پیوگی؟" اور مہترانی کا جواب آنے سے پہلے ہی اُس نے ایک آب خورے میں چائے انڈیل دی۔

"ہلیؤ تو کا ہے نا پیئیں!" دُلاری آکر باورچی خانے کے دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

اُس نے انگوٹھے اور کلمے کی اُنگلی سے کھجڑ کا کنارہ پکڑ کر کھجڑ مہترانی کی طرف بڑھایا۔

دُلاری کھجڑے کر باورچی خانے کی دیوار کے اس حصّے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، جو ابھی تک دھوپ سے بچا ہوا تھا اور پھونک پھونک کر سُڑ سُڑ چائے پینے لگی۔

اُس نے ایک پیڑھی، جس کے پائے لال اور پیلے رنگ ہوئے تھے، پیر سے کھسکائی اور اُس پہ باورچی خانے کے دروازے میں بیٹھ گئی۔

"کوئی خبر ملی؟" اُس نے پسینے سے بھیگے ململ کے سپید کرتے کو چٹکی سے پکڑ کر اپنے بوجھل سینے سے الگ کرتے ہوئے اور چائے کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر پوچھا۔

"کس کی؟" دُلاری نے کھجڑ زمین پہ رکھ کر جوابی سوال کیا۔

"رام بھروسے کی اور کِس کی!"

"اب کا کھبر ایہے اِتّے دنوں باد!" مہترانی نے بڑی نا اُمیدی سے کہا، مگر دوسرے ہی لمحے اُسے غصّہ آگیا: "اُسی کی۔ کے بھیتر گھُسا بیٹھا ہوئیے جا کو بھگا کر

لیگوا ہے ....“ اور اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو دُلاری نے رام بھروسے کو ایک موٹی سی گالی بھی دے ڈالی، ”داری جار کا ....“

وہ ”ہائیں ہائیں“ کرتی رہ گئی۔

”ماپھ کریو“ کہہ کر مہترانی نے جلدی سے کھپر خالی کر دیا اور کھڑی ہو گئی ”اب چلت ہیں بی بی جی، کیتوں گھر اور کمانا ہیں ابھی۔“ اس نے پاخانے میں سے اٹھا کر ٹوکری بائیں کولھے پہ رکھ لی اور دروازے کی طرف چلی، مگر رُک گئی، ”بٹیا گئیں؟“

”ہاں“

”اب پھر کب ایہیں؟“

”پتا نہیں ....“ اس نے کواڑ کی طرف جاتے ہوئے کہا، اور پھر مہترانی کے جانے کے بعد کنڈی لگا کر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جھاڑ پونچھ اور نہانے دھونے سے فارغ ہو کر اُس نے کپڑے بدلے، پھر باورچی خانے کی چوکھٹ سے لٹکے ہوئے چھینکے میں سے اتار کر دو پراٹھے اور تین کباب کھائے جو اس نے اس ناشتے میں سے بچا لئے تھے جو رات بیٹی اور داماد کے سفر کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ کنکر کی سرمئی رنگ کی صراحی سے دو کٹورے ٹھنڈا پانی پینے کے بعد زینہ چڑھ کر وہ برساتی میں چلی گئی۔

برساتی بھٹی بنی ہوئی تھی ــــــ تین کھڑکیاں تھیں، ایک پچھواڑے کی گلی کی طرف اور دو سامنے آنگن کی طرف ــــــ اُس نے تینوں کھڑکیاں کھول دیں۔

اُسے پسینے میں نہلائے بدن پہ لُو کی گرمی کی ٹھنڈک محسوس ہوئی ــــــ وہ گنگنانے لگی؛ گنگناتی رہی اور اِدھر اُدھر بکھری چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر سلیقے سے اُن کی جگہ رکھتی رہی۔

سب سے آخر میں اُس نے نواڑ کے اُن دو پلنگوں کا رُخ کیا جو برساتی کے

بیچوں بیچ ایک دوسرے سے ملے بچھے ہوئے تھے۔ ایک کا بستر جوں کا توں تھا۔ لیکن دوسرے کا شکن در شکن گنجلا ہوا تھا ــــــ اس بستر کی دری ایک طرف سے اتنی ہٹ گئی تھی کہ پٹی اور نواڑ نظر آ رہی تھی، دوسری طرف دری اور اس پر بچھی ہوئی چادر اتنی لٹک گئی تھی کہ فرش کو چھو رہی تھی، اوڑھنے کی مہین چادر اوڑھی نہیں گئی تھی اور ویسی ہی تہہ کی ہوئی بینتیا نے رکھی ہوئی تھی ــــــ دونوں بستروں کے تکیوں کے غلافوں پہ ہرے رنگ کے بیل بوٹے کڑھے ہوئے تھے۔ گنجلے بستر کا تکیہ اپنی جگہ پہ تھا سرہانے، لیکن دوسرے بستر کا تکیہ کھسک کر گنجلے بستر پہ آ گیا تھا۔

اُسے اس تکیے کی یہ بے قاعدگی پسند نہ آئی۔ اس نے اُسے اُٹھا کر دوسرے بستر کے سرہانے پٹخ سا دیا، لیکن فوراً ہی اس نے اس پر ایک ہلکا سا ہاتھ بھی پھیرا۔ جیسے بزرگ شفقت سے بچوں کے سر پر پھیرتے ہیں۔ پھر اس نے جھک کر گنجلی ہوئی چادر کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر دونوں چادروں، تکیے اور دری کو اٹھا کر ساتھ والے پلنگ پہ رکھا اور باری باری بچھانے کی چادر۔ اوڑھنے کی چادر اور دری کو جھاڑ کر دوبارہ بستر لگایا ــــــ وہ بستر لگا رہی تھی تو اُسے پلنگ کے نیچے ایک چھوٹا سا کپڑا پڑا نظر آیا تھا ــــــ اس نے کپڑے کو پیر سے کھسکا کر باہر نکالا ــــــ اُٹھا کر غور سے دیکھا۔ زیرِ لب "نہیں" کہا اور ٹین کی اس ٹوکری میں ڈال دیا جو پچھواڑے کی کھڑکی کے نیچے رکھی ہوئی تھی اور جس میں بیلے کے دو مرجھائے ہوئے ہار پہلے سے پڑے تھے۔ پھر وہ کھڑکی بند کر کے گنگناتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

پھر آنے والوں کا جیسے تانتا بندھ گیا۔

سب سے پہلے بُوا آئیں، جن کی آمد کی اُسے توقع نہیں تھی کیونکہ وہ پیر کا کہہ کے گئی تھیں۔

بُوا نے چادر اتار کر اُس سے گردن اور ماتھے کا پسینہ پونچھا، اور اُس کی چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھ کر اتوار ہی کو آجانے کی وجہ بیان کی، جو اُن کی یہ فکر تھی کہ "ہماری منّی ۔۔۔۔ بٹیا اور ان کے دولہا کے جانے کے بعد ۔۔۔۔ بالکل اکیلی ہو گی ۔۔۔۔ " اور " بھائیں بھائیں کرتا گھر کھانے کو دوڑ رہا ہو گا ۔۔۔ "

پھر انہوں نے " بٹیا اور اُن کے دولہا " کی روانگی کے بارے میں تابڑ توڑ کئی سوال کیے۔

جواب میں اس نے انھیں بتایا، " گاڑی لیٹ تھی، پورے ایک گھنٹے ۔۔۔۔ بھیڑ اچھی خاصی تھی، پھر بھی ڈبّے میں گھُس گئے تھے ۔۔۔۔ کاس گنج کے بعد شاید جگہ مل گئی ہو گی ۔۔۔۔ "

" رات بھر جاگے ہوں گے بچّے! "

" نہیں وہ کھانا کھانے کے بعد اوپر برساتی میں چلے گئے تھے، تھوڑا سونے۔" مسکراہٹ کی ایک جھلک اس کی آنکھوں میں نظر آئی۔

پھر اُس نے بُوا سے تابڑ توڑ کئی سوال کیے، جن کے جواب میں بُوا نے بتایا کہ فجلو رات بھر ہائے ہائے کرتا رہا، بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ کیا کرتیں۔ مجبوری تھی۔ صبح داگدر کو دکھانا پڑا، " میعادی بخار بتایا ہے اور لال دوا دی ہے ۔۔۔۔ پورا ایک روپیہ لیا ۔۔۔۔ غریبی میں آٹا گیلا ۔۔۔۔ ہاں، بخار اب کم ہے ۔۔۔۔ داماد ملا بھی تو نکمّا ۔۔۔۔ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا ۔۔۔۔ شبراتن پورے دنوں سے ہے اور وہ بخار چڑھا کے بیٹھا ہے! "

وہ ہنس دی ـــــــ بُوا بھی کمال کرتی ہیں ۔۔۔ فجلو نے کیا منت مانگی تھی کہ بخار چڑھے ۔۔۔۔ پیسوں کی بُوا فکر نہ کریں ۔۔۔۔ دوا دارو پر جو خرچہ آئے گا، وہ وہ دے گی ۔۔۔۔ نکمّا سہی، پر ایک مرد تو ہے گھر میں!

تب بُوا نے اسے بتایا کہ راستے میں سبزی والا مل گیا تھا، اس لئے انہوں نے کچھ ترکاریاں خرید لیں۔ اور اد امیاں کی دکان کھُلی تھی، اس لئے آدھ سیر گوشت بھی لے لیا، "وہ فجلو تو گیا کام سے کچھ دنوں کے واسطے .... سوچا، میں ہی کچھ لیتی چلوں، ورنہ پکے گا کیا گھر میں!"

"اچھا کیا ....،" اس نے تکیئے کے نیچے سے بٹوہ نکالا: "کتنے پیسے ہوئے؟"

"اے ہے، ایسی بھی کیا جلدی ہے ... لے لوں گی۔" اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں، مگر جب اس نے اصرار کیا تو انھوں نے انگلیوں پہ حساب کر کے بتایا، "ترکاریاں ساڑھے سات آنے کی اور ساڑھے چار آنے کا گوشت ... کُل گیارہ آنے ہوئے ... نہیں، بارہ آنے۔"

اس نے بٹوے سے ایک روپے کا ایک نوٹ نکال کر اُن کے حوالے کیا۔

انھوں نے چادر کے کونے کی گانٹھ کھول کر اس میں سے ایک چونّی نکالی، حساب بے باق کیا اور چادر اٹھا کر اپنی کوٹھری میں چلی گئیں جو کمرے کے بالمقابل دالان کے دوسرے سرے پہ تھی۔

پھر بہشتی کا بیٹا آیا، کمر پہ لال کپڑا لپیٹے اور اس پہ مشک لادے۔

اس نے اس سے کمرے کے دروازے کے ایک پٹ کی آڑ سے پوچھا کہ خیراتی کیوں نہیں آیا۔

"ابا کی ناف ٹل گئی ہے!"

اور جب وہ پھر مشک بھرنے مسجد گیا تو بُوا نے اس سے کہا، "اے ہے، بلاقی سے کیا پردہ ....! جیادا سے جیادا اپنی بیٹیا کی عُمر کا ہوگا!"

اُس نے بوُا کے اعتراض کو یکسر مسترد کر دیا: "پورا مرد لگتا ہے ...! کیسا ڈیل ڈول نکلا ہے لڑکے نے!"

جب بلاقی دوسری مشک کا پانی غسل خانے کے ایک مٹکے اور باورچی خانے کی ٹنکی میں انڈیل کر چلا گیا تب بُوا کو خیال آیا کہ ایک مشک اور منگوا لی جاتی تو آنگن میں چھڑکاؤ بھی ہو جاتا۔

اس نے دالان میں کھڑے ہو کر، جہاں سے دھوپ اب سرک چلی تھی، آسمان کی طرف دیکھا اور پنکھا جھلتے ہوئے کہا، "بارش ہوگی ..." حالانکہ آسمان بالکل صاف تھا۔ ہاں، لالہ جیون لال کے جیون نواس کے پیپل کے پتے اب تالیاں نہیں بجا رہے تھے، اور ردّی کاغذ کا ایک ٹکڑا اتنی دیر سے وہیں زینے کے نیچے رکھی گھڑونچی کے ایک پائے کے پاس بے سُدھ پڑا تھا۔

"کیا پکا رہی ہو؟" اُس نے دالان کے ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر پوچھا، جہاں سے باورچی خانے کے اندر کا منظر نظر آ رہا تھا۔

بُوا مٹی کے کُونڈے میں آٹا گوندھ رہی تھیں ــــــ انھوں نے کہا، "آلو گوشت۔"

"روٹیاں زیادہ ڈال لینا، شبراتن اور بچّوں کے لئے.... اور ہاں، رات کے کچھ کباب بچے رکھے ہیں، وہ بھی لیتی جانا۔"

بُوا نے اُسے پیار اور احسان بھری نظروں سے دیکھا، "چائے بناؤں؟"

"بناؤ...." وہ دالان میں بچھے تخت پر بھیلی تولیہ اُٹھا کر غسل خانے کی طرف چل دی، "تم پانی رکھو، میں اتنے میں نہائے لیتی ہوں.... بڑا حبس ہے!"

پھر پورن مالی آیا، "ہار بیلے کے!"

وہ جوڑے میں بال پن اُڑس رہی تھی، "کل ہی کہہ دیا تھا، آج سے مت دینا۔ بُوا۔ اس سے کہہ دو، نہیں چاہئیں۔"

بُوا پھر بھی موتیے کی آدھ کھلی کلیوں کے دو ہار لے آئیں: "لو!" اور ہار انہوں نے اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"میں کیا کروں گی ان کا!"

بُوا کی بوڑھی آنکھوں کو شاید وہ تغیّر نظر نہ آیا جو ہاروں کی پیش کش نے اس کے چہرے پر پیدا کر دیا تھا۔ ورنہ وہ نہ کہتیں: "جوڑے میں لپیٹ لو۔۔۔۔ اچھے لگیں گے!"

اُس نے ہار بُوا کے ہاتھ سے لے لئے اور جب وہ واپس باورچی خانے میں چلی گئیں تو اس نے ہاروں کا گُچّا بنا کر اُسے بس ایک بار سونگھا اور پھر اُس گھڑے کی گردن میں ڈال دیا جو زینے کے نیچے گھڑونچی پر رکھا ہوا تھا۔

اور جب ثریّا آئی تو سارے گھر میں ٹکاری آموں کی خوشبو پھیل گئی۔

ثریّا نے آموں سے بھری ٹوکری تخت پر رکھ کر اُسے بتایا کہ "ہمارے قائم گنج کے باغ کے ہیں:

"۔۔۔۔ ابّا لائے ہیں۔۔۔۔ بھیّا کو کہیں جانا تھا کام سے، وہ نہ آسکے۔ اس لئے ابّا چھوڑنے آئے ہیں۔۔۔ ٹھہریں گے نہیں۔۔۔ انہیں وکیل صاحب سے ملنے جانا ہے۔"

اتنے میں بُوا بھی باہر کا دروازہ بند کر کے آگئیں: "خاں صاحب تھے۔ سلام کہہ رہے تھے۔"

"وعلیکم" کہہ کر وہ ثریّا کے ساتھ بیٹھک میں چلی گئی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

وہ لڑکی کے نصاب میں شامل ایک غزل کے اشعار کے معنی سمجھاتی رہی اور

ثریا اس کی آواز پر کان لگائے اور رہ رہ کر اس کے چہرے پر نظریں جما کر، کبھی اُسے اور کبھی اپنے آپ کو پنکھا جھلتی رہی، اس ہاتھ سے اور اس ہاتھ سے۔

اور جب وہ اس شعر پر پہنچی،

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیئے کہ آرزو کیا ہے

تو اس سے نہ رہا گیا: "یہ تم مجھے لگاتار گھورے کیوں جا رہی ہو؟"

ثریا سٹپٹا سی گئی ——— پنکھا اس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر گر گیا ——— پنکھے کو فرش پر سے اُٹھانے میں جتنا وقت وہ لگا سکتی تھی، اس نے لگایا اور کہا: "بُرا نہ مانیں تو کہوں اُستانی جی!"

وہ چپ رہی۔

ثریا نے اس کی خاموشی کو "ہاں" سمجھ کر، بڑی ہمت کر کے، مگر جھجکے بنا، کہہ ہی دیا: "آج آپ بڑی پیاری لگ رہی ہیں!"

اس کے بدن کے خون نے اس کے گالوں پر ہلّہ بول دیا ——— اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے، سو جو بھی اس کی زبان پر آیا، اُس نے کہہ دیا: "چل ہٹ لڑکی .... بڑوں سے مذاق نہیں کرتے!"

"آپ جتنا چاہیں، ڈانٹ لیں .... پر اللہ قسم اُستانی جی، آج آپ واقعی بہت اچھی لگ رہی ہیں .... سچی .... روز سے زیادہ!"

"اچھا، اچھا،" کہہ کر وہ پھر غزل کی طرف رجوع ہو گئی۔

جب سبق ختم ہو گیا تو دونوں باہر آنگن میں آئیں ——— اُس نے بُوا سے کہا کہ وہ ثریا کو اس کے گھر تک چھوڑ آئیں۔

اور جب بُوا چادر لینے اپنی کوٹھری میں گئیں تو اس نے لڑکی کا سر اپنے سینے سے

لگا کر اس پر ہاتھ پھیرا اور کہا: "آموں کا شکریہ!"

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا، مگر اب نظر بھی نہیں آ رہا تھا، بس جبو ن تو اس کے پیپل کی پھننگی ابھی تک اس کی ڈوبتی سنہری روشنی کی زد میں تھی۔ تپش کم ہو گئی تھی، پر حبس کا وہی عالم تھا۔

وہ تخت کھینچ کر دالان سے آنگن میں لائی اور اس پہ پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

جب بُوا واپس آ گئیں تو اس نے ان سے کہا کہ وہ نکل لیں، ورنہ پھر اندھیرا ہو جائے گا۔

بُوا نے باورچی خانے میں کھانا باندھتے ہوئے اس سے کھانے کو پوچھا تو اس نے کہا، "نہیں، ابھی بھوک نہیں لگی ۔۔۔ ہاں، کل میں ساڑھے تین سے پہلے نہیں لوٹوں گی اسکول سے ۔۔۔۔ اس سے پہلے نہ آنا ۔۔۔ اور سنو، بچوں کے لئے کچھ آم بھی رکھ لو۔"

"خاں صاحب کے اپنے باغ کے ہیں۔" بُوا نے بھگوتے میں بھیگے ہوئے آموں میں سے چار آم اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں!"

"بڑے بھلے آدمی ہیں!"

"ہاں!"

"اور کیا شکل دی ہے اللّٰہ نے!"

"ہوں!"

"اللّٰہ جنت نصیب کرے ۔۔۔۔ بیوی بھی بڑی نیک تھیں اُن کی!"

"ہاں!"

"اب پھر شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ مسکرائی، "تمھیں کیسے معلوم؟"

"ثریا کو چھوڑنے گئی تھی ابی تو اُن کی اماں کو سلام کرنے چلی گئی اندر.... اُنوں نے بتایا۔"

"پھر کیا ہے... کہیں کر دو بات پکی!"

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر بوا کی آواز آئی، "بات تو میں ابی پکی کر دوں، بس کسی کے وہاں، کرنے کی دیر ہے۔"

تب اُسے احساس ہوا کہ جو کانٹا وہ بوا کے چبھو رہی تھی، وہ خود اس کے چبھ گیا ہے۔

وہ تیزی سے اٹھی، باورچی خانے میں گئی، نعمت خانے کے اوپر رکھی ہوئی ماچس کی ڈبیا اٹھا کر واپس آنگن میں آئی، دالان میں ٹنگی ہوئی لالٹین اتاری، جلائی، حالانکہ اندھیرا ابھی دُور تھا، ٹانگی اور ڈبیا رکھنے پھر باورچی خانے میں جا رہی تھی کہ گلی کے موڑ کی طرف سے سائیں بابا کی کھرجدار آواز آئی: "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔"

بُوا یہ کہتی اٹھیں کہ "ان کی جمیرات آج ہوئی ہے"؛ اور آٹے کے کنستر میں سے ایک کٹورا آٹا نکال کر دروازے کی طرف چلیں، مگر اس نے کٹورا ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا!" سائیں بابا نے دروازے کے سامنے رُک کر صدا لگائی۔

اس نے دروازے کا ایک پٹ تھوڑا سا کھول کر کٹورا اُن کی طرف بڑھایا اور جب انہوں نے آٹا اپنے کشکول میں ڈال کر کٹورا اُسے واپس کیا تو اس نے پٹ تھوڑا سا اور کھول دیا اور کانپ کر پردے کے پیچھے سے پوچھا، "بابا آپ کو آم پسند

ہیں؟"

سائیں بابا نے جواب دیا: "بیٹی، آم کسے اچھے نہیں لگتے!"

وہ تیز تیز قدموں سے گئی، دو آم لے کر لوٹی، پٹ پورا کھول کر اور سائیں بابا کے سامنے بالکل بے پردہ کھڑی ہو کر اس نے وہ آم دونوں ہاتھوں میں رکھ کر انہیں ایسے پیش کئے جیسے کسی کو نذرانہ پیش کر رہی ہو۔

سائیں بابا نے کوشش کرتے ہوئے کہ اس کے چہرے پر ان کی نظر نہ پڑے، آم اس سلیقے سے اٹھائے کہ ان کا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے ذرا بھی مس نہ ہوا، اور وہ اُسے دعائیں دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

وہ چند لمحے کھُلے دروازے میں کھڑی اُن کے لمبے تڑنگے، چوڑے چکلے جسم کو گلی کی تنگی کا مذاق اڑاتے دیکھتی رہی۔

وہ صحن میں واپس آئی تو اس نے بُوا کو، کھانے کی پوٹلی پاس رکھے، تخت پر بیٹھا پایا: "کیا رات یہیں رہنے کا ارادہ ہے!"

بُوا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھا لیا: "منّی رانی، میں کلام مجید کی قسم کھا کے کہتی ہوں، بات انُوں نے شروع کی تھی..... خاں صاحب کی اماں نے۔"

وہ کچھ سمجھی، کچھ نہیں سمجھی: "کیسی بات....؟ کون سی بات...؟"

بُوا اس کی کلائی پکڑے رہیں: "صاف صاف تو نہیں کہا انُوں نے، پر اس سے جیادا صاف اور کیا کہتیں بھی کیا..... کہنے لگیں، تمہاری نجر میں کوئی مناسب رشتا ہو تو بتانا۔"

اس نے آہستہ سے اپنی کلائی چھڑائی اور بہت رسان سے کہا: "کیوں ستاتی ہو مجھے بُوا!"

"لو اور سنو..... ! میں اپنی جان کے ٹکڑے کو ستاؤں گی.... جیسے اِن ہاتھوں

میں کھلایا، پال پوس کے بڑا کیا، اُسے ستاؤں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمارا دُکھ نہیں دیکھا جاتا، اس لئے کہتی ہوں"

"اور بار بار کہتی ہو حالانکہ جواب پہلے سے معلوم ہے۔ ۔ ۔ ۔ اسے ستانا نہیں تو اور کیا کہتے ہیں!"

"پہلے تو بٹیا تھیں بیچ میں، اب وہ فکر بھی دُور ہوئی۔ ۔"

"میں نے کبھی کہا کہ بٹیا رُکاوٹ ہیں؟"

"نہیں کہا تو کیا ہوا، میں کیا اِتّا بی نہیں سمجھتی!"

"تم خاک نہیں سمجھتیں!"

"پڑھی لکھی نہیں ہیں تماری طریوں تو یہ نہ سمجھیو کہ جاہل ہوں۔ ۔ ۔ ۔ میں بی سمجھتی ہوں رنڈاپے کے دُکھ، ہاں۔ ۔ ۔ ۔! بیوا ہوئی تو جوان نہیں بھتی، پر بڑھیا بی نہیں بھتی۔ ۔ ۔ مجھے سب مالوم ہے منی رانی!"

"تو پھر تم نے کیوں نہ کرلی دوسری شادی؟"

"کوئی ملا ہی نہیں، ورنہ میں تو پر دبر کرتی، دوسرا خصم!"

وہ ہنس دی: "حجت کرنا کوئی تم سے سیکھے بُوا!" اس نے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں سے اب اندھیرے کی پھوار گرنی شروع ہوگئی بھتی۔ "اب نکل لو، ورنہ مرگھٹ والی بھتنی راستہ روکے گی!"

بارہویں کا چاند اب اتنا روشن تھا کہ لالٹین کی معلق روشنی شرمارہی بھتی۔ حبس دم توڑ رہا تھا، جیون تو اس کے پیپل کے پتے اب رہ رہ کر تالیاں بجا رہے تھے — بھیگی ہوا کے جھونکوں نے پنکھا اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ، جو جوڑے کی قید سے نکل بھاگی بھتی، رہ رہ کر اس کے گال سے کھیل رہی بھتی۔ اُس کا بھرا بھرا بدن

کچھ سویا کچھ جاگا، تخت پر دراز تھا۔

ایک زور کا جھونکا آیا، بہت بھیگا ہوا۔ معلق روشنی نے دالان کے فرش پر کئی ٹیڑھے میڑھے خاکے بنا ڈالے۔ برساتی کی جو کھڑکیاں وہ کھلی چھوڑ آئی تھی، ان کے پٹوں دھڑ دھڑ کی۔ دالان میں رکھی ہوئی کنکر کی صراحی پر ڈھنکا ہوا نقشی کٹورا ترچھی ٹوپی بن گیا۔ اور آنگن کے کچے فرش نے تھوڑی سی دھول اس کے چہرے پر پھینک دی جسے صاف کرنے کے لئے اس نے سپید کرتے کا دامن اوپر اٹھایا تو چاندنی نے وارفتہ ہو کر اس کے ملائم پیٹ کے پیار پر پیار لے ڈالے۔

پھر کہیں دور بجلی کڑکی۔

ایک، دو، تین، چار ـــــ جب وہ چودہ پر پہنچی، تب دوسری بار بجلی کی کڑک سنائی دی۔

اس نے پھر گنتی شروع کی ـــــ اس بار بارہ پر ہی کڑکی، اور اگلی بار دس پر۔ بارش آ رہی ہے اور بڑی تیزی سے آ رہی ہے ـــــ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

بادل کا ایک تابگزار ٹکڑا چاند کے سامنے سے گزرا ـــــ آنگن میں پھر چاندنی پھیل گئی۔

اس نے مڑ کر پورب کی طرف دیکھا، پوری فوج چلی آ رہی ہے۔

آسمان پر بادل چھا گئے اور زمین پر اندھیرا ـــــ بڑی زور سے بجلی چمکی اور گھر کی تقریباً ہر چیز ملنے بھر کے لئے اچھل کر اندھیرے کے غار سے روشنی کی وادی میں آئی اور پھر غار میں واپس چلی گئی۔

وہ جوں کی توں بیٹھی رہی۔

تم بجلی سے نہیں ڈرتیں؟

نہیں!

کمال ہے ... عورتوں کا تو پیشاب خطا ہو جاتا ہے ڈر کے مارے!

چھی..... ! چھی ..... !

چند موٹی بوندیں اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر گریں ——— اس نے تخت اور آنگن کے کچّے فرش پر کئی موٹی موٹی بوندوں کے گرنے کی آواز سنی۔ وہ اُٹھ کر دالان میں آگئی۔

بہت سی بوندیں تاڑ تاڑ کچّے فرش پر گریں تو سوندھی خوشبو کی لپٹیں نتھنوں کے راستے اس کے دماغ میں داخل ہو کر اودھم مچانے لگیں ——— اس نے سر کو دالان کے ایک کھمبے کا سہارا دیا۔

بجلی چمکی اور اس نے آنگن میں بہت سے بُلبُلے بنتے اور پھوٹتے دیکھے

اُس نے کُرتے کی آستین چڑھا کر ہاتھ آنگن کی طرف بڑھایا جیسے سوالی بڑھاتا ہے۔ ذرا کی ذرا میں ہاتھ کہنی تک بھیگ گیا ——— اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

وہ کھمبے سے سر ٹکائے، خالی خالی نظروں سے، بجلی کے بادلوں کا سینہ چیر کر عریاں ہونے اور پھر پردے میں چلے جانے اور بُلبُلوں کے پانی کے دھاروں کے ساتھ بہنے اور پھر پانی ہو جانے کا منظر دیکھتی رہی، دیکھتی رہی ——— پھر اس نے لالٹین اتاری، اس کی لَو دھیمی کی اور کمرے میں چلی گئی۔

کوئی آٹھ دس منٹ بعد وہ کمرے سے باہر آئی، جھجکتی، بدن چرائے، جیسے بیس اکیس برس پہلے، سہاگ کے ابتدائی دنوں میں وہ اسی کمرے سے صبح گھونگھٹ نکالے، ساس سسر سے نظریں چرائے، شرماتی لجاتی نکلا کرتی تھی اور اس کا شوہر اُسے کمرے سے باہر جانے سے پہلے، لباس کی ایک ایک شکن کو ٹھیک کرتے، بالوں کی اُلجھی لٹوں کو سلجھاتے اور آئینے میں گردن اور گالوں پر پیار کے چغل خور نشانوں کی تلاش کرتے دیکھ کر، بستر پر اوندھا ہو کر اور تکیے میں منہ دے کر کھی کھی ہنسا کرتا تھا۔

لے ہے، کیا معصومیت ہے، کیا بھولپن ہے ... جیسے ابا اماں کچھ جانتے ہی نہیں!

تو کیا بے حیائی کا لبادہ اوڑھ لوں!

نہیں ... میرے خیال میں بُرقع ٹھیک رہے گا!

جائیے، ہم نہیں بولتے .....!

اُس نے بڑی احتیاط سے دروازہ بھیڑا، جیسے کسی کے اُٹھ جانے کا خدشہ ہو، اور آہستہ آہستہ دبے قدموں دالان کے بیچ میں آئی، جیسے ڈر ہو کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔

ہوا کا ایک ٹھنڈا اور بھیگا جھونکا اس کے چوٹی سے ایڑی تک ننگے بدن سے ٹکرایا ——— اس نے جھرجھری لی۔

اب نہ بادل گرج رہے تھے، نہ بجلی چمک رہی تھی، بس بارش ہو رہی تھی، مگر زور شور سے نہیں۔

اس نے پہلے ایک پیر آنگن میں رکھا، پھر دوسرا۔

بارش نے اپنی بہت سی لڑیاں اس کی خوددار گردن، مغرور سینے، لجاتی پیٹھ اور اتراتے کولھوں پر نچھاور کر دیں۔ اُس کے بازو اس کے ابھرے ہوئے سینے پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ اُس نے بادل چھائے آسمان کی طرف مُنہ اٹھا کر آنکھیں بند کر لیں ——— پھر اُس کے کانوں نے بجلی کی کڑک سُنی، پپوٹوں کے پردے کے پیچھے سے اُس نے بجلی کی چمک دیکھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

بارش اب پھر زور شور سے ہو رہی تھی۔

اُس کے دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اُٹھ گئے اور آنگن کی گیلی مٹی پر اس کے پیروں نے گردش شروع کی، جو تیز ہوتی گئی، تیز ہوتی گئی، تیز ہوتی گئی۔

بادلوں نے گرج کر اور بجلی نے کڑک کر اُسے کئی بار منع کیا، مگر اُس کا جسم نہیں

مانا اور گردش کرتا رہا، کرتا رہا، حتیٰ کہ بادل، دیواریں، چھتیں، آنگن، دالان، کھمبے ہر چیز اس کے ساتھ گردش کرنے لگی۔

وہ لڑکھڑاتی ہوئی تخت پر کچھ گری، کچھ بیٹھی اور اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

بارش رک گئی، بادل چھٹ گئے، چاند پھر نکل آیا ــــــ چاندنی نے اس کے نڈھال کندھوں پر بڑی نرمی، بڑی شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہا: اب اٹھو... !

وہ اٹھی اور کھوئی کھوئی سی کمرے میں چلی گئی۔

پندرہ بیس منٹ بعد وہ کمرے سے باہر آئی تو وہی میلا غرارہ اور کرتا پہنے ہوئے تھی جس میں گیارہ بارہ گھنٹے پہلے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

آنگن پار کر کے اس نے زینہ چڑھنا شروع کیا ــــــ ابھی آدھا زینہ ہی چڑھی تھی کہ رک گئی۔

واپس آئی ــــــ زینے کے نیچے گھڑونچی پر رکھے ہوئے گھڑے کی گردن سے موتیے کی ادھ کھلی کلیوں کے بھیگے ہار اتارے اور زینہ چڑھ کر برساتی میں چلی گئی۔

ہار تکیے کے پاس رکھ کر اور ان کی طرف منہ کر کے وہ اس بستر پر لیٹ گئی جو اس نے دوپہر کو ٹھیک کیا تھا، مگر نیند اسے بہت دیر میں، بڑی مشکل سے آئی۔

تشنۂ فریاد

لندن ۔ ۱۹۸۷ء

شعور،
دہلی

محراب
لاہور

واہ میاں ضمیر الدین احمد! "تشنۂ فریاد" کیا عمدہ کہانی لکھی ہے۔ مجھے بہت پسند آئی۔ زبان و بیان دونوں میں مشاقی دکھائی ہے۔ اور بنت میں وہ ضبط جو ہمارے لکھنے والوں سے سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔

ضیا محی الدین

"تشنۂ فریاد" بیٹھ کے پڑھا تو دو دن تک بخار میں بستلا رہا..... پہلی بار "کرائم اینڈ پنشمنٹ" پڑھا تھا تو ایک ہفتہ سخت بخار کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا..... برسوں بعد ایسی کہانی پڑھنے میں آئی اور ابھی تک خمار اپنے اسی درجے پر قائم ہے۔ اللہ! آپ نے اتنی بڑی صلاحیت کو اتنے عرصے پابندِ سلاسل کیوں رکھا۔؟

کمال احمد رضوی

جب میں نے "تشنۂ فریاد" پڑھی تھی میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ اور میری اداسی بہت زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ مجھے..... بے نام مرکزی کردار کے المیئے نے متاثر کیا..... ریڈر کے دل میں تو اس عورت کے لئے عزت اور محبت ہی پیدا ہوتی ہے۔ دردمندی بڑے ادب کی ایک پہچان ہے..... ہزار مبارکیں!

پاکستان میں۔ یہاں (ہندوستان میں)، اور ڈھاکا میں بھی آپ کی کہانیاں "تشنۂ فریاد" اور "سوکھے ساون" بہت پسند کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے جو حد سے زیادہ مبارکباد دی گئی ہے وہ آپ قبول کیجیے!۔

بلراج مین را

بڑی خوبصورت اور دل آویز کہانیاں ہیں..... انتظار حسین سے بات ہو رہی تھی۔ وہ تمھارے یہ افسانے پڑھ چکے ہیں۔ تعریف کر رہے تھے۔

اسلم فرخی

دونوں کہانیوں میں یو۔ پی کے پرانے ... مسلم معاشرے کی پہچان بہت واضح ہے .... ۔ اگرچہ ان سے ایک عہد کے معاشرتی حجابات اور امتناعات کی تضحیک و تردید کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ لیکن ان کے بیان سے اُس عہد کی سچائی پر حرف نہیں آتا .....

ضمیر الدین احمد نے یہ کہانیاں اِس انداز سے بنی ہیں کہ اِن میں کہانیوں کے کردار۔ کرداروں کے ماحول ۔ اُن کی معاشرت اور اُن کے زمانے کا رنگ ساتھ ساتھ ابھرتا ہے۔ مزید برآں یہ رنگ جیسے کچھ اوپر سے دکھائی دیتے ہیں اُسی کے پہلو بہ پہلو اِن میں چھپے ہوئے کچھ اور رنگ بھی سامنے آتے ہیں ۔ صاف پتا چلتا ہے کہ لکھنے والے کی نگاہ اشیاء اور مظاہر اور افراد کی بیرونی پرت کو چیرنے اور اندر کی سچائیوں کو پہچاننے کی قوّت بھی رکھتی ہے ....

نفسیاتی حقیقت نگاری کے وہ آداب ۔ جن سے ہماری روایت کا تعارف منٹو اور بیدی نے کرایا تھا ۔ ان کہانیوں میں جوں کے توں دوہرائے نہیں گئے ۔ یہاں اُن آداب کی توسیع ہوئی ہے ۔

شمیم حنفی

میں اٹاری میں لیٹا ساقی کے افسانہ نمبر میں منٹو کی ایک کہانی پڑھ رہا تھا کہ کھڑکی پہ دستک ہوئی، جو ہماری اٹاری کے سامنے والی چھت اور پیش کار صاحب کے کوٹھے کو ملاتی اور جُدا کرتی تھی۔

میں نے چند لمحے انتظار کیا ـــــ پھر دستک ہوئی۔

اس بار میں کھلے رسالے کو بستر پہ اُلٹا رکھ کر اُٹھا اور کھڑکی کے پاس گیا، جو اتنی بڑی تھی کہ نا تما شخص اُس میں سے کھڑا گزر جائے۔

مجھے معلوم تھا کہ کھڑکی کس نے کھٹکھٹائی ہے، پھر بھی میں نے پوچھا: "کون ہے؟"

"میں ہوں بھیّا..... ! میں !" اُس نے اِدھر سے بہت آہستہ سے کہا۔

میں نے کہا: "وہ تو نہیں ہیں۔"

اس نے کہا: "مجھے معلوم ہے .... قنوج گئے ہیں مشاعرے میں ..."

چند لمحے خاموشی رہی، پھر اُس نے جھجکتے ہوئے کہا: "تم سے کچھ کہنا ہے۔"

توقع کی ایک لہر میرے سارے بدن میں دوڑ گئی: "ذرا ٹھہریے !"

میں لپک کر چھجے تک گیا۔

نیچے اندر کے صحن میں سنّاٹا تھا۔ سامنے کے دالان میں بھی سنّاٹا تھا۔

ابّا جان زمینوں پر گئے ہوئے تھے، اس لئے باہر کی بیٹھک اور اس سے ملے ہوئے اُن کے کمرے میں کسی کے موجود ہونے کا سوال ہی نہیں تھا ____ پٹھانی اپنی کٹھریا میں اونگھ رہی ہوں گی اور ان کے میاں، جن کو رنگ صاف ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں سارے گھر والے کالے ماموں کہتے تھے، مہمان خانے کے آنگن میں نیم کے پیڑ کے نیچے اپنا جھلنگا بچھائے سو رہے ہوں گے اور اُن کا بیٹا چھٹّن موقع غنیمت جان کر کسی کوٹھری میں چھپ کر کوئی فحش ناول پڑھ رہا ہوگا ____ اور امّی جان اور نانی اماں؟ اٹاری کے سامنے والی چھت کے نیچے جو بڑا کمرہ تھا، وہاں سے آنگن کے راستے بھنبھناہٹ جیسی آواز آرہی تھی۔ امّی جان فیّاض علی کا دوسرا ناول جو میں نے کل ہی انھیں لاکے دیا تھا، اونچی آواز سے پڑھ رہی ہوں گی۔ نانی اماں سُن رہی ہوں گی۔ خیراتن پنکھا کھینچ رہی ہو گی۔ اور چھوٹے میاں دھوپ میں باہر قدم نہ رکھنے کے حکم کی تعمیل میں دری کے فرش پر آنکھیں بند کیے، سورج ڈھلنے کے انتظار میں کروٹیں بدل رہے ہوں گے ....۔ نہیں، وہ تو اسکول میں ہوگا۔

میں نے صحن میں اُترنے والے زینے کے دروازے کی کنڈی لگائی، ایسے کہ آواز نہ ہو اور تیزی سے واپس کھڑکی کے پاس جاکے کہا، "فرمایئے، کیا حکم ہے؟"

کنڈی کھُلنے کی آواز آئی ____ پھر کھڑکی کا ایک پٹ تھوڑا سا کھُلا اور مجھے کانچ کی فیروز آبادی چوڑیوں سے بھری ہوئی ایک کلائی، مہندی سے رچی ہوئی ایک ہتھیلی، ایک کلمے کی انگلی اور ایک انگوٹھا اور اس چٹکی میں ملس کے چُنے ہوئے لہریئے دوپٹے کا ایک تنا ہوا پلّو نظر آیا، جس کے پیچھے سے

اس کا دایاں گال جھلک رہا تھا۔

"کوئی ہے تو نہیں"؟

"جی نہیں .... میدان بالکل صاف ہے!" میں نے کھڑکی پوری کھول دی۔ اُدھر کی چھت ہماری چھت سے تھوڑی نیچی تھی، اس لیے اس کھڑکی کے راستے دونوں گھروں کے درمیان آمد و رفت کے لئے ادھر ایک چھوٹا سا زینہ بنا دیا گیا تھا — اس نے زینے پہ قدم رکھا، مگر ٹھٹک گئی: "تم آ جاؤ ادھر.... گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

ایسا معلوم ہوا، جیسے دلہن خود باجے تاشے کے ساتھ برات لے کر دولہا کے گھر پہنچ گئی ہو۔

میں نے جلدی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور زینہ اتر کر اس کی چھت پہ پہنچ گیا۔

اس نے دوسرے ہاتھ سے آنچل چہرے کے سامنے کیا، مُڑ کر زینے پہ قدم رکھا، ہاتھ بڑھا کر کھڑکی بند کی، کنڈی لگائی اور ویسے ہی پیٹھ اور پچھاڑی میری طرف اور منہ کھڑکی کی طرف کیے بولی، "تم کمرے میں چلو .... میں آتی ہوں۔"

اس چھت سے ملی ایک اور چھت تھی اور اس کے ساتھ وہ کمرہ تھا جس میں چلنے کو اُس نے کہا تھا۔

میرا اشتیاق تقریباً بھگاتا ہوا مجھے کمرے میں لے گیا۔ جس کی کھُلی کھڑکی میں سے سڑک کے اُس پار مسجد کے کلس نظر آ رہے تھے، تو یہاں عیش کرتے ہیں رُسوا صاحب!

اس کمرے میں میں بیسیوں بار آیا گیا تھا، مگر جب سے اس نے مجھ سے

پردہ شروع کیا تھا، تب سے نہیں۔

پچھلی دیوار سے لگی ایک مسہری بچھی ہوئی تھی جس کے بستر پر ایک کڑھا ہوا ریشمی پلنگ پوش سجا ہوا تھا، دو دروازے تھے، اُن کے بیچ میں جو جگہ تھی، وہاں ایک تخت بچھا ہوا تھا جس پہ ایک جا نماز تہہ کی ہوئی رکھی تھی اور ایک گاؤ تکیہ دیوار سے ٹکا ہوا تھا۔ مسہری اور تخت کے بیچ میں ایک گول میز پر شیشے کا ایک لیمپ رکھا ہوا تھا اور پاس ہی ایک آرام کرسی رکھی ہوئی تھی۔ فرش کچّا تھا مگر اُس پر اس کنارے سے اُس کنارے تک نیلی اور لال پٹیوں کی موٹی دری بچھی ہوئی تھی۔ دونوں دروازے، جو اندر کی طرف کھلتے تھے، کھلے ہوئے تھے۔

میں آرام کرسی پہ بیٹھنا چاہتا تھا کہ اپنی حماقت پر مسکرایا اور جا کر مسہری کی پٹی پر ٹک گیا۔

وہ آئی اور ایک دروازے کے پٹ کی آڑ لے کر ایسے کھڑی ہو گئی کہ بس پاپلین کے تنگ پاجامے میں پھنسی ہوئی اس کی ایک پنڈلی مجھے نظر آئی۔

"بھیّا، تم ہمارا ایک کام کر دو۔"

"ایک نہیں دس ...... بلکہ دس بار!"

"ہنسی مذاق میں نہ ٹالو بھیّا ...... میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں!"

میں تنگ پاجامے میں پھنسی ہوئی اس کی پنڈلی پہ نظر گاڑے ہوئے تھا، ہاتھ تو مجھے جوڑنا چاہئیں بی بی!

میں نے کہا: "مگر ذرا سامنے تو آئیے ...... !" میں پٹی سے کھسک کر بستر پہ چلا گیا: "آخر یہ پردہ کب تک ...... کیا میں نے پہلے آپ کو کبھی دیکھا نہیں!"

"تب کی بات اور تھی!"

"کیوں؟"

"تب تم لڑکے تھے!"

"اور اب؟"

"اب ماشاء اللہ۔۔۔"

"جوان ہوں؟"

"ہاں!"

"یہ خطا تو یقیناً مجھ سے سرزد ہوئی ہے!"

"ہنسی مذاق کی بات نہیں بھیّا۔۔۔ میں واقعی بہت پریشان ہوں!"

وہ دروازے کے پٹ کی آڑ لے کر جوں کی توں کھڑی تھی، یہ تو کوئی اور بات معلوم ہوتی ہے؟

میں نے کہا، "اچھا ہنسی مذاق ختم۔۔۔ مگر آپ کو سامنے آنا پڑے گا، ورنہ بندہ چلا!" اور میں نے ایک پیر پر تھوڑا سا زور ڈالا جیسے مسہری پر سے اٹھنا چاہتا ہوں۔

وہ جھجکتی ہوئی سامنے آ گئی۔ مگر گھونگھٹ نکالے ہوئے، ایسے کہ پھر بھی اُس کا چہرہ نظر آ رہا تھا، جسے میں نے پہلی بار نظر بھر کر ویسے دیکھا جیسے دیکھنا چاہیئے ایسے چہروں کو۔

واہ کیا چہرہ تھا!

جھکی ہوئی آنکھوں پر بڑی بڑی پلکوں کا سایہ، گالوں کی کھال ایک دم تنی ہوئی، نتھنے کہ اب پھڑکے، اب پھڑکے، ہونٹ کہ وہ دیکھو، مسکرائے، اور دوپٹے کی سلوٹیں سینے کی سربلندی کے سامنے عاجز۔

میں نے مسہری پہ ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا کہ آئیے، یہاں بیٹھیے۔
اُس نے جھکی نظروں سے میرا اشارہ دیکھا مگر بیٹھی آرام کرسی پر، اس طرح کہ اس کا پورا چہرہ میری طرف نہیں تھا۔
میں نے کہا، "جی، اب فرمائیے، کیا حکم ہے؟"
وہ تھوڑی دیر اپنی طلے کی جوتی کو دیکھتی رہی، پھر بولی، "تم انھیں سمجھا دو!"
میں نے چند لمحے انتظار کیا، لیکن جب اس نے کچھ اور نہ کہا تو پوچھا، "کیا سمجھا دوں؟"
"یہی کہ وہ اب مجھ سے نہ ملیں۔" وہ چکن کے کُرتے کے دامن کو اپنی بھری بھری ران پہ رکھ کر اُس کی شکنیں نکالنے لگی اور تب مجھے اُس کے چہرے پر پریشانی کا غبار نظر آیا۔
میں نے کہا، "کیوں ...؟ میرا مطلب ہے، انھوں نے پوچھا، کیوں تو میں کیا جواب دوں؟"
شکنیں اور زور سے نکالی جانے لگیں، "ورنہ مجھ پہ کوئی مصیبت آن پڑے گی ... سچ ... کئی دن سے میرا دل بہت دھڑک رہا ہے!"
میں اس کے مصروف ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا، خمیرہ مروارید کھائیے محترمہ کہ مقوئ قلب ہوتا ہے۔
میں نے کہا: "آپ کہتی ہیں تو میں کہہ دوں گا، پہ دلیل کمزور سی ہے ... ہے نا؟"
اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی رانوں کے بیچ میں رکھ لیے، "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ... مجھے ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے!"

"ہو سکتا ہے کہ یہ محض آپ کا وہم ہو۔"

"شاید ...... پر میرا خیال ہے کہ پیش کار صاحب کو شبہ ہو گیا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

اس نے گردن کو تھوڑا سا موڑ کر مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔

میں نے کہا: "میرا مطلب ہے، آپ کو یہ شبہ کیوں ہوا کہ پیش کار صاحب کو شبہ ہو گیا ہے .... رسوا صاحب کبھی سڑک کے راستے گھر میں آئے نہیں .... کہیں باہر کبھی آپ ان سے ملیں نہیں کہ کسی نے دیکھ لیا ہو اور پیش کار صاحب کو خبر کر دی ہو ..... وہ ہمیشہ ہماری چھت کے راستے سے آئے گئے اور ایسے وقت جب آپ کے گھر میں کوئی نہیں ہوتا ..... پیش کار صاحب کچہری میں ہوتے ہیں اور بڑی بی صرف صبح شام آتی ہیں .... کہیں کوئی خط وط تو نہیں بھیجا، آپ نے انھیں، یا انھوں نے آپ کو کہ کسی کے ہاتھ لگ گیا ہو۔"

"نہیں!"

"تو پھر؟"

"ادھر کئی دن سے پیش کار صاحب بدلے بدلے سے نظر آ رہے ہیں .... اور ان کی آنکھیں، جیسے ہر وقت مجھ پر جمی رہتی ہیں۔"

میں اس کی جھکی ہوئی نظروں کی طرف دیکھ رہا تھا، بی بی آپ چیز ہی ایسی ہیں۔

میں نے کہا: "میرے خیال میں تو آپ کا شبہ بالکل بے بنیاد ہے۔"

"ایک بات اور .... میرا دل مجھے ادھر کئی دن سے ملامت کر رہا ہے .... شریفوں کا محلّہ ہے۔ کہیں بھانڈا پھوٹ گیا تو بڑی بدنامی ہو گی اور محلّہ الگ بدنام ہو گا .... بھیّا، تم انھیں سمجھا دو کہ بس اب یہ قصّہ ختم ہونا چاہیئے ....

میں زندگی بھر تمھارا احسان نہ بھولوں گی۔"

احسان ....! اور احسان کا بدلہ ....!

توقع کا ایک نیا بلبلہ بنا، ہاں، رسوا کو سمجھا بجھا کر آمادہ کر لینے ہی میں فائدہ ہے! اگر مان جائے۔

میں نے کہا: "ایک مشکل نظر آرہی ہے..."

اس نے پھر مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا: "اگر انھوں نے کہا، 'تم کیوں پڑتے ہو بیچ میں .... وہ خود کیوں نہیں کرتیں مجھ سے بات'، تو میں کیا کہوں گا!"

"نہیں بھیّا، وہ تم سے ایسی بات کبھی نہیں کہیں گے .... تمھاری ان کی دوستی جو ہے .... مجھے یقین ہے!"

"میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا، لیکن اگر آپ بھی سمجھائیں تو بہتر رہے گا.... رہے گا کہ نہیں؟"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی، پھر بولی، "بات یہ ہے بھیّا، کل میں نے بات شروع کی تھی .... صاف صاف کہنے کی تو ہمت نہیں ہوئی، گھما پھرا کر اشاروں میں کچھ کہا، مگر وہ تو بگڑ گئے .... سچّی بھیّا، مجھے ان سے ڈر لگتا ہے!"

میں نے اس کی طرف دیکھا، تو بات دراصل یہ ہے!

میں نے کہا: "اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے!"

"تمھارے دوست مزاج کے ذرا تیز ہیں!"

"ہوا کریں ...! پہل آپ نے کی تھی، آپ خاتمہ بھی کر سکتی ہیں۔"

اس کا چہرہ لال ہو گیا: "نہ کہیں ...! میں نے کب کی تھی پہل!"

"اور غزل کی فرمائش کس نے کی تھی؟"

"اچھی لگی تھی، مانگ لی.... مگر کلائی تو انھوں نے پکڑی تھی جب میں نے کاغذ لینے کے ہاتھ بڑھایا تھا۔"

"لیکن ہم کو پہلے سے معلوم تھا کہ آپ انھیں کھڑکی کے پیچھے سے چھپ چھپ کے دیکھتی ہیں!"

اُس کا چہرہ اور لال ہو گیا، "اور وہ جو تمھاری اٹاری کے دروازے کے پیچھے سے چھُپ چھُپ کے مجھے دیکھا کرتے تھے جب میں خالہ کے پاس نیچے جاتی تھی.... کیا بجا ہے؟"

میں نے گھڑی دیکھی، "ساڑھے تین۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، "بڑی بی کے آنے کا وقت ہو رہا ہے.... اب تم جاؤ بھیّا، مگر بھولنا نہیں۔"

"نہیں.... میں بات کروں گا ان سے اور پھر بتاؤں گا آپ کو.... یہی دوپہر کا وقت ٹھیک رہے گا نا؟"

"مگر تم مت کھٹکھٹانا کھڑکی، میں خود موقع دیکھ کر بات کروں گی تم سے۔"

اور پھر میں چوروں کی طرح، کھڑکی کی کنڈی کھول کر، دبے قدموں اپنی چھت پر آیا، ویسے ہی جیسے میں نے کتنی ہی بار رسوا کو اُس کھڑکی کے راستے واپس آتے دیکھا تھا۔

دوسرے شام کو کوئی ڈھائی میل تک مجاز کی "آوارہ" کو ترقی پسندی کے اصولوں کی کسوٹی پر کسنے کے بعد، جب کمال گنج مشکل سے آدھ میل رہ گیا ہو گا، ہم سستانے کے لئے ایک پلیا کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر تک پھولی ہوئی شفق کے پس منظر میں دُور تک پھیلے ہوئے کھیتوں، بور سے لدے ہوئے

آم کے پیڑوں، گھروں کو لوٹتے ہوئے تھکے کسانوں اور تھکے بیلوں کو دیکھتے رہے اور کچھ دوری پر ایک جٹا دھاری برگد میں چڑیوں کی بسیرے سے پہلے کی چہکار، کنکر کی سپید سڑک پر سے گزرتی ہوئی اکا دکا بیل گاڑیوں کی چرخ چوں اور اُن میں جتے ہوئے بیلوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں اور کہیں پاس ہی سے آتی ہوئی سنکھ کی آواز سنتے رہے۔

ہمارے پیچھے آم کے باغ میں ایک کوئل کوکی، پھر سامنے سے ایک یکّہ گزرا جس میں پردہ بندھا ہوا تھا... پیچھے کا پردہ ذرا سا کھسکا اور ایک نسوانی چہرہ نظر آیا اور دور تک نظر آتا چلا گیا۔

رسوا نے میری طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے کہا، "مانتے ہیں بھئی، مانتے ہیں!"

پھر وہ تھوڑی دیر تک گنگناتا رہا، "سنو، ایک نظم ہوئی ہے۔"

میں نے کہا، "ارشاد!"

اس نے ترنم کے ساتھ نظم سنائی ـــــ پھیلتا ہوا اندھیرا، ہر طرف سنّاٹا، کھلی فضا اور رسوا کی سریلی آواز، سماں بندھ گیا ـــــ نظم میں کسی شبستانِ وصال کی تصویر کھینچی گئی تھی اور تصویر میں مکھڑے کی دمک، آنکھوں کی حیا، بدن کی خوشبو، سانسوں کی آنچ اور سینے کی پھڑپھڑاتے ہوئے پنچھیوں کے رنگ بھرے گئے تھے ـــــ اس مصرع کی تکرار تھی، رات پھر بجلی سی میرے سامنے لہرائی ہے۔

"بہت اچھے، بھئی بہت اچھے!" میں نے دل کھول کے داد دی۔

اس نے جھک کر ہاتھ اور منہ سے آداب عرض کئے۔

میں نے پوچھا، "اسی پر ہے نا؟"

"ہاں!"

"کل میں نے بھی اس شبستان کی سیر کی۔"

جیسے پلنگ کے نیچے سے نکل کر کسی بچھو نے اس کے ڈنک مار دیا: "تم نے...؟ تم کیا کرنے گئے تھے اس کمرے میں؟"

"اس سے ملنے، اور کیا کرنے!" اُسے پریشان کرنے میں مجھے مزا آ رہا تھا، "مگر خود نہیں گیا تھا...."

"تو پھر؟"

"بلایا گیا تھا۔"

"بچھو نے پھر ڈنک مارا: "ناممکن!"

تب میں نے اُس کی مشکل آسان کر دی ـــــــ میں نے اُسے گئے دن کی ملاقات کی وہ باتیں بتا دیں جن کے علاوہ، میرے خیال میں، کچھ اور بتانا نہ ضروری تھا نہ مناسب۔

وہ سوچ میں پڑ گیا: "نہ جانے کیا ہو گیا ہے اُسے .... مجھ سے بھی پرسوں یہی بات کہی، کھُل کے تو نہیں، مگر اشارہ صاف تھا..... معلوم ہوتا ہے، جی بھر گیا ہے ..... ایسی عورتوں کا کوئی ٹھیک نہیں..... کسی اور کو تاک لیا ہو گا۔" وہ میرے چہرے پہ کچھ ڈھونڈنے لگا۔

جی بھر گیا' کے ٹکڑے پر میں نے دل ہی دل میں آمنّا صدّقنا کہا، مگر اُسے جلدی سے یقین دلایا کہ اوّل تو میں اپنے جگری دوست کی محبوبہ کے بارے میں ایسی کوئی بات سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں، اور دوسرے اس کا دل ہرگز نہیں بھرا ہے، بلکہ میرا اندازہ تو یہ ہے کہ وہ اب بھی اُس کی دیوانی ہے، بات میرے خیال میں وہی ہے، جو اُس نے کہی ہے .... ڈر بیٹھ گیا ہے دل میں۔

عمر ہی کیا ہے ابھی ... ! زیادہ سے زیادہ ستائیس اٹھائیس کی ہو گی اور پھر نومشق!"
رسوا ڈنک ونک بھول کے مسکرایا: "نومشقی کی ایک ہی کہی .... ! وہ جادو جگانا
آتے ہیں کہ کیا کہوں!"
"مگر دیکھنے میں تو ..."
"جی ہاں .... ! دیکھنے میں یہ سب ایسی ہی لگتی ہیں۔ منہ سونگھو تو ماں کے
دودھ کی خوشبو آئے ... لیکن بندہ بھی ہاتھ میں آئے، شکار کو ایسی آسانی کے
چھوڑنے والا نہیں!"
مجھے رسوا کے تیور اچھے نہیں لگے ـــــ میں نے ایسے ہی کہہ دیا: "میں نے
سمجھا بجھا کر اُسے ایک اور ملاقات کے لئے تیار کر لیا ہے کہ شکار اور شکاری مستقبل
کا فیصلہ خود کرلیں ... اس کے تیوروں سے تو میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہ یہ
سلسلہ اب ختم کرنا چاہتی ہے، ویسے یہ کون جانتا ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے ...
اور ہاں، وہ چاہتی ہے کہ یہ ملاقات گھر پر نہ ہو، کہیں اور ہو۔"
اس بار رسوا کی پٹھان رگ نہ پھڑکی، اور واپسی میں ہم نے کافی سوچ بچار
کے بعد طے کیا کہ یہ ملاقات کہاں اور کیسے ہو۔
اگلے دن دوپہر کو اُس نے پھر کھڑکی کھٹکھٹائی۔
میں تھوڑی دیر پہلے ہی نیچے کا جائزہ لے کر اور یہ اطمینان کر کے کہ حالات
معمول پر ہیں، اوپر آیا تھا۔ پھر بھی میں نے زینے کے دروازے کی کنڈی چڑھادی
اور اس زینے کی بھی جو چھت سے سیدھا نیچے گلی میں جاتا تھا اور جسے رسوا
اکثر استعمال کرتا تھا۔
"آئیے!" میں نے کھڑکی کے پاس جا کر کہا۔
اس نے اپنی طرف سے کنڈی کھولی اور پھر کھڑکی، مگر وہ زینہ نہ چڑھی: "نہیں

بھیا، تم آجاؤ ادھر!"

میری نگاہوں اور اس کے چہرے کے بیچ دوپٹے کے پلّو کا پردہ نہیں تھا، بس گھونگھٹ تھوڑا سا نکلا ہوا تھا، اور میں کرسی پر بیٹھا اور وہ مسہری پر، لیکن نظریں اس نے پھر بھی جھکا رکھی تھیں۔

"ہوئی بات اُن سے؟"

"ہاں" کہہ کر میں نے اُسے وہ سب کچھ بتا دیا جو ایک شام پہلے پُلیا پر بیٹھ کر میں نے رسوا سے اور رسوا نے مجھ سے کہا تھا، اُن تمام باتوں سمیت جن کا بیان میرے جگری دوست نے اس کی جادو جگانے کی صلاحیت اور مہارت کے بارے میں کیا تھا، مگر اُن الفاظ میں نہیں۔ اپنے پردہ دار الفاظ میں کہ چوٹ تو پڑے مگر زور کی نہیں۔

اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، "جس کے لئے عاقبت خراب کی، وہی ایسا کہے... اس سے تو اچھا تھا کہ موت آجاتی...!" اس نے دوپٹے کے کونے سے پہلے اس اور پھر اُس آنکھ کے آنسو کو روکا، "میرا ہے کون اس دنیا میں... نہ بھائی، نہ بہن، نہ کوئی اور سگا... ماں باپ تھے، سو وہ ان کے پلّے باندھ کے..." اس نے ہاتھ سے فرش کی جانب اشارہ کیا، گویا نیچے گھر میں کہیں بیرسٹر صاحب موجود ہیں، "جنّت سدھارے...!" اس کی آنکھیں پھر ڈبڈبا آئیں۔

میں کرسی موڑ کر بالکل اُس کے سامنے ہو گیا، "ارے یہ کیا...!" اور میں نے اس کے دوپٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر اس نے جلدی سے خود ہی آنکھیں خشک کر لیں۔

میں نے کہا، "اصل میں یہ آپ کے رسوا صاحب جو ہیں، ان کو غصّہ ذرا جلدی آجاتا ہے، اور یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ غصّے میں آدمی جو کچھ منہ میں آتا ہے

کہہ ڈالتا ہے ..... میں نے جب رُسوا صاحب کو بتایا کہ آپ اب یہ سلسلہ ختم کرنا چاہتی ہیں تو بگڑ گئے ...... ویسے یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ آپ سے اتنا لگاؤ نہ ہوتا تو اتنا بگڑتے کیوں .... آپ کو نہیں معلوم، انھوں نے آپ پر ایک نظم لکھی ہے!"

اس کا دایاں ہاتھ تیزی سے سینے پر گیا، منہ سے "ہائے اللہ" نکلی، پھر وہی ہاتھ منہ پر گیا اور گالوں پر لالی پھیل گئی۔ "نہ جانے کیا کچھ لکھ ڈالا ہوگا... کبھی کبھی تو ایسی باتیں کرتے ہیں کہ شرم آنے لگتی ہے ....." لالی اور گہری ہوگئی: "تم نے سُنی؟"

"نہیں.... بس یہ بتایا کہ آپ پر ایک زوردار نظم لکھی ہے ..... میں نے بہت فرمائش کی، پر نہیں مانے، کہنے لگے: "مشاعرے میں سُننا۔"

"کون سے مشاعرے میں؟"

تب میں نے اُسے بتایا کہ مشاعرہ چودھویں کی رات 'پریڈ کے میدان میں' ڈاک بنگلے کے سامنے ہورہا ہے' اور طے یہ پایا کہ یہ آخری ملاقات اس موقع پر ہو اور یہ بھی کہ کیوں ـــــ لال ڈگی زیادہ سے زیادہ ڈاک بنگلے سے سَو سوا سَو گز دور ہوگی۔ اس کے چاروں طرف گھنے پیڑ ہیں۔ دو ایک جھنڈ بھی ہیں، جن کے اندر کا منظر دن میں بھی باہر سے مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ ملاقات کے لئے اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہوسکتی: "جب رُسوا صاحب کی باری آئے تو آپ تیار ہو جائیے گا ..... وہ اپنا کلام پیش کرکے باہر چلے جائیں گے، تھوڑی دیر بعد آپ بھی نکل آئیے گا.... خواتین کی نشست کا انتظام ڈاک بنگلے کے برآمدے میں چقوں کے پیچھے ہوگا۔ مشاعرہ سامنے لان میں ہوگا۔ پیچھے کی طرف سے نکلیے گا، مگر برقع اوڑھ کے .... میں آپ کو وہیں ملوں گا اور لال ڈگی تک

آپ کے ساتھ رہوں گا.... پھر آپ ہوں گی اور رسوا صاحب.... بندہ پہریداری کرے گا اور کسی کو آپ کے عیش میں مخل نہیں ہونے دے گا۔"

وہ شرما گئی۔

میں نے کہا، "ایک بات اور.... جب ایک بار کھنکاروں تو سمجھیے گا، خطرہ ہے... دو بار کھنکاروں تو مطلب یہ کہ خطرہ سر پہ آ پہنچا ہے۔"

"مگر یہ لال ڈگی اور یہ مشاعرہ... ! یہاں نہیں مل سکتے تھے !"

"پتا نہیں... ! ان کی تجویز ہے... !"

"اور اگر پیش کار صاحب نے انکار کر دیا کہ کوئی ضرورت نہیں مشاعرے شاعرے میں جانے کی تو.... وہ تو کہتے ہیں کہ یہ سب لغویات ہے !"

"پہلے بھی تو جا چکی ہیں آپ.... کہیے گا، خالہ لیے جا رہی ہیں، مگر امّی جان سے بات کر لیجیے گا پہلے۔"

امّی نے اسی شام خالہ سے بات کی۔

اسی رات پیش کار صاحب، عشاء کی نماز کے بعد بیگم صاحبہ کی خدمت میں تسلیمات عرض کرنے آئے ـــــ باہر کے آنگن میں بید کی کرسی پہ بیٹھ کر شرمندہ ہوئے کہ اتنے دنوں بعد حاضر ہوئے ہیں۔

امّی جان نے بیٹھک کے دروازے کی آڑ سے ان کی بیٹی حسینہ کی خیر خیریت دریافت کی، جس کے میاں کا کان پور میں جوتوں کا کاروبار تھا ـــــ اور پھر ان کو اطلاع دی کہ وہ ان کی دلہن کو چودھویں کے مشاعرے میں اپنے ساتھ لے جائیں گی۔

پیش کار صاحب کے منہ سے اعتراض کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

میں اُن کے سامنے، بید کی ایک اور کرسی پر بیٹھا ہوا، ان کی کالی رنگت، ان کی آدھی سے زیادہ سپید داڑھی اور ان کے موٹے پیٹ کو دیکھتا رہا جو کرتے

کے پیچھے چھپنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

اُن کے جانے کے بعد جب میں نے امّی جان کو بتایا کہ بڑے غور سے دیکھنے کے باوجود مجھے پیش کار صاحب کے پاجامے میں کوئی جیب نظر نہیں آئی تو انھوں نے کہا، "ایسی جیبیں اگر نظر آجائیں تو پھر اُن کا فائدہ ہی کیا ... !" اور میں ہنستا ہوا رسوا کو خوش خبری سنانے چلا گیا۔

اس مشاعرے میں پہلے کے مشاعروں سے زیادہ بھیڑ تھی، خاص کر ڈاک بنگلے کے برآمدے کی چقوں کے پیچھے، کیونکہ خبر اڑ گئی تھی کہ یوسف صاحب بھی آئیں گے، جو نئے نئے کلکٹر ہو کر آئے تھے اور جو نہ صرف جوان تھے، بلکہ گورے اور بڑے جامہ زیب بھی ـــــ وہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں تشریف لائے اور صدرِ مشاعرہ کے پاس بٹھائے گئے۔

میں ڈاک بنگلے کے پچھواڑے کا ایک چکّر لگانے جا رہا تھا کہ مہدی وکیل کی منجھلی بیٹی کشور نے، جو اسی دن علی گڑھ سے چھٹیاں گزارنے آئی تھی، مجھے چق کے پیچھے سے آواز دی۔

"ہو گئیں نازل!" میں نے تھوڑی سی ہٹی ہوئی چق کے پاس جا کے کہا۔

اس نے روٹھے بنا کہا، "میرا ایک کام کر دو، میرے اچھے بھیّا!"

"بتاؤ!"

"ذرا یہ پرچہ یوسف صاحب کو دے دو ..." اور اس نے پرچہ مجھے دے دیا۔

"تم کہاں سے جانتی ہو انھیں؟"

"کہیں سے بھی نہیں!"

"تو پھر یہ نامہ و پیام کیسے ...! دیدوں کا پانی مر گیا ہے، یا علی گڑھ کی ہوا لگ گئی ہے ... کہہ دوں جا کے چچا میاں سے!"

اُس نے کہا: "اب بنو مت زیادہ!"

اُس کے پاس جو لڑکی کھڑی تھی، وہ ہنسی اور اُس نے کہا، "قبلہ، پہلے پرچہ تو پڑھ لیجیے!"

میں نے پرچہ کھولا ـــــ لکھا تھا، یوسف صاحب، آپ بھی کچھ سنائیں۔

"اس پر دستخط کرو!" میں نے پرچہ ہنستی ہوئی چق اور کشور کی طرف بڑھایا۔

"جاؤ، ہم نہیں بولتے!"

"اچھا منہ نہ پھلاؤ..... بات در اصل یہ ہے کہ یوسف صاحب شاعری نہیں کرتے..... نِرے آئی سی ایس ہیں.... پہلے معلوم تو کر لیا ہوتا!"

"تمھیں کیسے معلوم؟"

"معلوم ہے، تبھی تو کہہ رہا ہوں۔"

"واہ..... ! تھوڑی بہت شاعری سبھی کرتے ہیں!"

"لیکن یوسف صاحب نہیں کرتے... ویسے اور کوئی پیغام ہو تو..."

"اچھا...؟" اُس نے پیر پٹخے، "ابھی جا کے کہتی ہوں بڑی اماں سے!"

میں ہنستا ہوا اور پرچے کے ٹکڑے کرتا ہوا ڈاک بنگلے کے پیچھے چلا گیا۔

رُسوا کی باری کوئی ساڑھے دس بجے آئی جب مشاعرہ جم چکا تھا۔

میں پہلے ہی سے ڈاک بنگلے کے پیچھے ٹہل رہا تھا ـــــ نظم پڑھنے کے کوئی تین چار منٹ بعد رُسوا آیا اور لال ڈگی کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ڈاک بنگلے کے احاطے کا دروازہ کھلا اور وہ کالا برقع اوڑھے، مگر نقاب اُلٹے، اِدھر اُدھر دیکھتی، تیز تیز قدموں سے میرے پاس آئی اور ہم دونوں بھی لال ڈگی کی طرف چل دیئے ـــــ میں رہ رہ کر پیچھے مڑ کے

دیکھتا رہا کہ کہیں کوئی آ تو نہیں رہا ہے، دیکھ تو نہیں رہا ہے۔

جب ہم پیڑوں کی وہ قطار پار کر کے، جو لال ڈگی کا پردہ کیے ہوئے بھتی شرع کے انگریزوں کے بنوائے ہوئے اس پکّے تالاب کے کنارے پہنچے تو ایک درخت کی اوٹ سے رُسوا نمودار ہوا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا، جائیے، اور وہ جھینپتی ہوئی رُسوا کی طرف بڑھ گئی اور دیکھتے دیکھتے وہ دونوں اُس جھنڈ میں غائب ہو گئے جو تالاب کے اس طرف تھا۔

میں بھی دبے قدموں اُدھر چلا، اس لئے نہیں کہ کن سوئیاں لینا چاہتا تھا، بلکہ اس لئے کہ ناگہانی خطرے کی صورت میں اُنھیں جلد اور اچھی طرح خبردار کر سکوں۔ اور جھُنڈ کے دس بارہ گز اِدھر رُک گیا۔

کئی منٹ تک جھنڈ میں سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آئی، یا کم از کم میرے کانوں تک نہیں پہنچی۔ پھر آہستہ آہستہ باتوں کی آواز آنی شروع ہوئی، مگر صاف ایک لفظ بھی سُنائی نہیں دے رہا تھا۔

میں تھوڑا اور بڑھا ـــــ آواز بند ہو گئی، بس کانچ کی چوڑیاں دو ایک بار کھنکیں۔ پھر ایک "نہیں"، سنائی دی اور فوراً بعد "تمھیں میرے سر کی قسم" پھر رُسوا کی، "اچھا، بس ....." اور پھر زمین پر بکھرے ہوئے پتوں پر کسی کے بیٹھنے کی آواز، اور پھر گونگی خاموشی۔

میں نے، جہاں میں کھڑا تھا، وہیں سے جھنڈ کے اندر جھانکا، مگر مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں جھُنڈ کے تھوڑا اور قریب ہو گیا، مگر نظر اب بھی کچھ نہ آ رہا تھا ـــــ اور آگے بڑھنا مناسب نہ تھا، میں وہیں بیٹھ گیا۔

جھُنڈ کے اندر پھر گفتگو شروع ہوئی ـــــ اب آوازیں کافی صاف آ رہی

تھیں۔ چونکہ کہا سنا دبی آواز میں جا رہا تھا، اس لئے یہاں وہاں ایک آدھ لفظ ڈوبکی لگا جاتا، لیکن پھر بھی مفہوم کا تسلسل برقرار رہا۔

وہ رسوا کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کیوں اب یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیئے، لگ بھگ انہی الفاظ میں جن میں اس نے مجھ سے اپنی وجہ بیان کی تھی، لیکن ساتھ ہی تڑپ، بے قراری، اندر کی آگ کا بھی ذکر تھا، یقین دلانے کی خاطر قسمیں بھی تھیں۔ رسوا کے سر کی، اس کی جان کی، اس کی جوانی کی، اور کوسنے اور بد دعائیں بھی تھیں اپنے لئے: "کل کی آتی آج آجائے ۔۔۔!" "میرے کیڑے پڑیں ۔۔۔!" "میری مٹی خراب ہو ۔۔۔!" بیچ بیچ میں میرے شاعر دوست کی آواز بھی آرہی تھی۔ وہ عقل و ہوش کی باتیں کر رہا تھا، سمجھا بجھا رہا تھا، مگر اس کی دلیلیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں ـــــــ پھر اس نے پینترا بدلا، "پیچھا چھڑانا چاہتی ہو ۔۔۔!" "جی بھر گیا ۔۔۔!" "جب تک چاہا کھیلیں، پھر اٹھا کے پھینک دیا ۔۔۔" تب گھٹے گھٹے سے رونے کی آواز آئی، ایک سسکی، ایک لمبی ٹھنڈی سانس: ایک "ہائے!" اور پھر، "یہ جانتی تو آگ لگاتی نہ گھر کو میں!" لیکن رسوا پر یہ کلام نرم و نازک بے اثر رہا۔ اس نے ایک اور پینترا بدلا: "تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔۔۔!" "گنگا میں ڈوب مروں گا ۔۔۔!" "زہر کھالوں گا ۔۔۔!" رونے کی آواز ایک دم بند ہو گئی، "زہر کھائیں تمھارے دشمن ۔۔۔! تمھیں میرے سر کی قسم، ایسے کلام اب پھر کبھی مت لانا زبان پر، نہیں تو ہمارا منہ دیکھنے کو ترس جاؤگے، ہاں ۔۔۔! ہم کیا مر گئے ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہو!" اور پھر ایک بے لفظ آواز آئی جس کا مطلب میں چھ سات برس کا ہوتا تب بھی سمجھ جاتا ـــــــ اور پھر سراپا سناٹا۔

میں جلدی سے، ایک کے بعد ایک، دو بار کھنکارا۔

جھنڈ میں سے رسوا کا سر نمودار ہوا: "کیا ہے؟" اس کی دبی دبی سی آواز

میں جھلاہٹ اور اندیشے، دونوں کی جھلک تھی۔

میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا: "کوئی آ رہا تھا!"

"اِدھر؟"

"شاید.... قدموں کی چاپ سنائی دی تھی!"

وہ سامنے پتوں کے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سہما ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں خوشی ہوئی کہ برقعے کا نچلا حصہ ابھی تک اس کے بدن پر ہے۔

رُسوا نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی: "کوئی بھی نہیں!"

"شاید کسی اور طرف نکل گیا ہو، یا شاید مجھے شبہ ہوا ہو۔"

"ہت تیرے کی!" کہہ کر وہ مڑا۔

"ویسے بھی اب چلنا چاہیئے.... دیر ہو رہی ہے!"

"بس تھوڑی دیر اور!"

"نہیں.... میں تو چلا.... تم رکنا چاہتے ہو تو شوق سے رُکو۔"

اس سے پہلے کہ رُسوا کچھ کہہ پائے، وہ برقعے کے نچلے حصے میں چپکے ہوئے پتے جھاڑتی ہوئی کھڑی ہو گئی:

"نہیں اب چلنا چاہیئے.... واقعی دیر ہو گئی ہے!" اُس نے پتوں کے فرش پر سے برقعے کا اُوپر کا حصہ اٹھایا، جھاڑا اور پہن لیا۔

لال ڈگی اور ڈاک بنگلے کے آدھے بیچ اِملی کا ایک بڑا سا پیڑ تھا ——— اس کے تنے کے پیچھے رُک کر اس نے برقع اتارا، احتیاط سے تہہ کر کے بائیں بازو پر رکھا، سیدھا ہاتھ دو تین بار بالوں میں پھیرا، ایک نظر لباس پر ڈالی، مڑ کر رُسوا کو دیکھا جو اُس کے پیچھے تھا۔ دائیں بائیں نظر دوڑائی اور تیزی سے ڈاک بنگلے

کے احاطے میں داخل ہو گئی۔

مشاعرہ ابھی تک جما ہوا تھا

دوسرے دن شام کو رسوا میرے گھر آیا، تھوڑی دیر نیچے رُکا۔ امّی جان کو سلام کیا، نانی اماں سے "جیتے رہو" لی، امّی جان سے نظم کی داد اور پھر سیدھا اوپر۔

وہ خوش تھا ـــــ مجھے معلوم تھا، کیوں ـــــ لیکن میں نے پھر بھی سبب پوچھا۔

اُس نے وہ شعلہ و شبنم غزل سُنائی جو رات اُن دونوں نے لال ڈگی کے جھنڈ میں کہی تھی، مگر چند شعر حذف کر کے، مقطع اس نے فی البدیہہ کہا: "معاملہ بالکل ٹھیک ہو گیا ہے اور راوی اب پھر چین ہی چین لکھتا ہے!"

دو تین بار اس نے کھڑکی کی درز میں سے بیش کار صاحب کے گھر میں جھانکا، مگر وہ نظر نہ آئی ـــــ وہ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، پھر کل آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

وہ کل، پرسوں، ترسوں، لگاتار چار دن دوپہر کو آیا ـــــ کھڑکی میں سے جھانکتا، پر کچھ نظر نہ آتا۔ پھر کھڑکی پہ آہستہ سے دستک دیتا، پر کوئی جواب نہ ملتا۔

چوتھے دن وہ کوئی چھوٹی سی لکڑی ڈھونڈنے لگا۔

میں نے پوچھا: "کیا کرو گے؟"

بولا: "لکڑی ڈال کر کنڈی کھولوں گا۔"

میں نے کہا، "خدا کے لئے ایسا مت کرنا... کوئی اور ہوا گھر میں تو غضب ہو جائے گا۔"

لکڑی نہیں ملی ـــــ وہ اٹاری کے چکر لگاتا رہا، لگاتار رہا، پھر چلا گیا۔

پانچویں دوپہر وہ نہیں آیا اور اسی دوپہر ادھر سے دستک ہوئی۔

کھڑکی کھلی تو وہ سامنے تھی، گھونگھٹ تھوڑا سا نکلا ہوا، نگاہیں نیچی، لجائی سی، بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو اُس نے میری طرف بڑھایا: "یہ انھیں دے دینا، آج ہی!"

میں نے لفافہ لے لیا ـــــ بہت سا گوند لگا کے بند کیا گیا تھا، مگر اس پر کوئی پتا لکھا تھا نہ کسی کا نام۔

"پڑھنا مت!" اُس نے التجا کی۔

میں نے کہا، "آپ بے فکر رہیے!"

اُس نے "آج ہی!" کہہ کر کھڑکی بند کر دی اور کنڈی چڑھا دی۔

جی تو بہت چاہا مگر میں نے گیلا کر کے لفافہ کھولنے کی کوشش نہ کی، کچھ تو گوند کی بہتات کی وجہ سے اور کچھ یہ سوچ کر کہ رسوا خط پڑھ کے سنائے نہ سنائے، مضمون تو بہرحال بتا دے گا۔

اور یہی ہوا۔

رسوا نے دو بار خط پڑھنے کے بعد، پہلے بے صبری سے اور پھر آہستہ آہستہ، اہم مقامات پر رُک رُک کر، بتایا کہ بلایا ہے، ان کے پیش کار صاحب کلکٹر صاحب کے ساتھ دورے پر گئے ہوئے ہیں، کل واپس آئیں گے۔ دسرات کے لئے بڑی بی کو گھر پر چھوڑ گئے ہیں، اس لئے دن کو ملاقات میں خطرہ ہے، لہٰذا رات کو بلایا ہے، آج رات کو، گیارہ کے بعد، اُس وقت تک بڑی بی گہری نیند میں ہوں گی، کھڑکی کنڈی کھلی ہوئی ہو گی، مگر پہلے جھانک کے دیکھ لینا۔۔۔ ہمارے۔۔۔۔

لے ہے، قربان جائیے اس 'ہمائے' کے... 'ہمارے کمرے میں روشنی ہو تو ہرگز نہ آنا... اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا...!'

سورج ڈھلا ہی تھا کہ رسوا آدھمکا ـــــ کھانا اس نے ہمارے ساتھ کھایا، اور جب امّی جان، نانی اماں اور چھوٹے میاں جا کے باہر آنگن میں لیٹ گئے تو دس کے قریب میرے ساتھ اوپر آگیا۔

زینہ چڑھنے سے پہلے میں نے کالے ماموں سے کہا کہ وہ دروازے بند کر لیں، رسوا صاحب باہر کے زینے سے چلے جائیں گے۔

ہم نے فوراً کھڑکی میں سے جھانکا ـــــ "ہمائے کمرے میں ابھی روشنی ہو رہی تھی۔

رسوا اٹاری میں بیٹھ کر کتابیں اور رسالے کھولنے اور بند کرنے لگا پھر وہ باہر گیا، پھر جھانکا اور واپس آگیا: "انتظار اور ابھی، اور ابھی، اور ابھی...!"

تھوڑی دیر بعد پھر باہر گیا اور پھر واپس آگیا۔

میں نے کہا: "ابھی گیارہ میں دیر ہے۔"

"اور بڑھیا نہ سوئی آج رات تو؟"

یُں ہنس پڑا۔ "سوئے گی کیوں نہیں... کیا اُسے بھی تمھارا انتظار ہے؟"

ابھی گیارہ بجنے میں پانچ سات منٹ تھے کہ وہ چوتھی بار کھڑکی کے پاس گیا ـــــ میں اس کے ساتھ تھا۔

ہم دونوں نے جھانک کر دیکھا ـــــ "ہمائے کمرے میں اب اندھیرا تھا۔

اُس نے بڑی احتیاط سے کھڑکی کا صرف ایک پٹ کھولا، جھک کے اور ترچھا ہو کر اَدھ کھلی کھڑکی میں سے گزرا، چھوٹا سا زینہ اتر کر چھت پر پہنچا، اور پھر جُھکا جُھکا، چوروں کی طرح دیوار سے لگا لگا اس چھت سے سامنے کی چھت پر اور

اُس چھت سے کمرے میں داخل ہوا اور پھر کمرے کے اندھیرے نے اس پر اپنی کالی چادر ڈال دی۔

میں نے کھڑکی کا پٹ بھیڑا، اندر کے صحن کے زینے کے دروازے کی کنڈی لگائی اور چھت پر بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا۔

جب اس نے مجھے جگایا تو آسمان کا رنگ ہلکا پڑ چلا تھا۔

"تم کنڈی لگا لو ۔۔۔ میں جا رہا ہوں ۔" اس نے مجھ پر جھک کر بہت آہستہ سے کہا۔

میں "اچھا" کہہ کر آنکھیں ملتا اُٹھا۔

اتنے میں وہ باہر کے زینے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا، "شام کو ملنا"۔ میں نے ایک بار پھر "اچھا" کہا اور دروازے کی کنڈی لگا کر پھر لیٹ گیا۔

شام کو رُسوا سے ملاقات نہ ہو سکی، کیونکہ امّی جان کے ساتھ مہدی چچا کے ہاں جانا پڑا۔

میں نے بچ نکلنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ نہ مانیں، "بُری بات ہے ۔۔۔! اور تم کو خاص طور سے بلوایا ہے کہ بھیّا ضرور آئیں!"

دوسرے دن جب ابّا جان زمینوں پر سے لوٹے تو یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ میں پی سی ایس کے مقابلے میں کامیاب ہو گیا ہوں ــــــ نانی اماں دو نفل شکرانے کے پڑھ چکی تھیں؛ امّی جان کا دیسے ہی لانبا قد اور لمبا ہو چکا تھا، خیراتن انکشاف کر چکی تھی کہ اس نے نوگزے پیر کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانے کی منت مانگی تھی، کلّے ماموں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ دیکھ لینا، بھیّا ایک نہ ایک دن ضرور کلکٹر بن جائیں گے، چھٹن فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ میری اردلی میں رہے گا؛

پٹھانی کو خیال آ چکا تھا کہ مٹھائی تقسیم ہونی چاہیئے، چھوٹے میاں اسکول میں تھے، ورنہ مجھ سے کم از کم دس روپے ضرور اینٹھ چکے ہوتے۔

ابّا جان آئے اور انھوں نے یہ خوش خبری سُنی تو پہلے تو مجھے گلے سے لگایا، پھر امّی جان سے کہا، "میں نہ کہتا تھا.... !" اور پھر دالان کو، جہاں سب جمع تھے، اس سرے سے اُس سرے تک اور اس سرے سے اس سرے تک، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی تیس مرتبہ اپنے قدموں سے ناپا۔

پھر کالی چرن حلوائی کی دکان سے مٹھائی آئی اور عزیزوں، دوستوں اور ملاقاتیوں کے گھر بھیجی گئی ـــــ اور تکیے کے فقیروں میں پیسے تقسیم کیے گئے۔

اور پھر چچی بی، خبر پاتے ہی، مع اپنی تینوں بیٹیوں اپیا، کشور اور ناہید کے آئیں اور آتے ہی انھوں نے میری بلائیں لیں۔ اور پھر بالکل ان کے انداز میں کشور نے، بلکہ اس نے انگلیاں زیادہ زور سے چٹخائیں ـــــ خوب قہقہے پڑے۔

کشور نے سر جھکا کر، تھوڑا سا گھونگھٹ نکال کے اور دائیں ہاتھ کو چلّو بنا کر اور ٹھوڑی کے پاس لے جا کر، مجھ سے کہا، "بندی تسلیمات عرض کرتی ہے، ڈپٹی کلکٹر صاحب !"

میں نے اس کے ایک ہلکی سی چپت رسید کرنے کے لئے ہاتھ اُٹھایا اور وہ "دیکھیئے بڑی امّی !" چلاتی ہوئی بھاگی اور جا کر امّی جان کے پیچھے چھُپ گئی ـــــ پھر قہقہے پڑے۔

میں نے دیکھا ـــــ امّی جان نے ابّا جان کی طرف دیکھا، مگر ابّا جان کی آنکھوں نے کوئی صاف جواب نہ دیا۔

چچی بی نے پہلے امّی جان کی طرف دیکھا، پھر ابّا جان کی طرف، کچھ سوچا اور ایک بار پھر میری بلائیں لے ڈالیں۔

اور پھر رسوا آیا ــــــــ اسے باہر کی بیٹھک میں بٹھایا گیا جہاں منشی جی، جو ابّا جان کے ساتھ لوٹے تھے، زمینوں کے حساب کتاب کا دفتر کھولے بیٹھے تھے، اور جہاں اس وقت مطلب کی بات کا کوئی موقع نہیں نکل سکتا تھا۔

پھر رسوا کو مٹھائی پیش کی گئی ــــــــ اور جب وہ موتی چور کا ایک لڈّو اور برفی کی ایک ڈلی کھا چکا تو پہلے کشور بھراپیا اور پھر ناہید نے، دہیں دالان میں سے اس سے غزل کی فرمائش کی، اور جب اس کے انکار پر تینوں نے، مگر سب سے زیادہ اپیا نے، کورس میں "غزل، غزل، غزل" کا شور مچایا تو اس نے لہک لہک کر ایک پھڑکتی ہوئی غزل سنائی۔

بڑا ہنگامہ رہا ــــــــ بڑا مزا آیا۔

دوسرے روز اس خبر کی مکھّی سارے قصبے میں بھنبھناتی پھری کہ پیش کار صاحب کی بیوی بھاگ گئی ہے۔

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ خبر کیسے اُڑی اور کس نے اُڑائی۔

پیش کار صاحب کی بڑی بی جو اُن کی پہلی بیوی کے بہت مُنہ چڑھی تھیں، جب صبح ہی صبح یہ معلوم کرنے ہمارے ہاں آئی تھیں کہ "چھوٹی پیش کارن یہاں تو نہیں ہیں" تو انھوں نے اپنے سپید چونڈے کی قسم کھا کے امّی جان کو یقین دلایا تھا کہ اب تک نہ کسی سے کہا ہے انھوں نے، نہ کہیں گی، "سمجھو میرے ہونٹ سلے ہوئے ہیں"۔

ابّا جان سے، جو سات سال پہلے ان کی پہلی بیوی کے انتقال کے وقت ان کے گھر گئے تھے، اور اب سات سال بعد پھر گئے تھے، پیش کار صاحب نے خود کہا تھا "بات اپنے تک رکھیے گا!"

مگر خبر پھر بھی پھیل گئی۔

خیراتن نے گلی میں ڈاکٹر پرشوتم داس کی مہری سے سُنی؛ کالے ماموں نے نادر قصائی کی دکان پر چھیٹن کو نواب پٹواری نے سُنائی۔

"رڈیڈ" منصف فاروق حسن کی ملازمہ، جو ہماری پٹھانی کی گوئیاں تھی۔ انھیں یہ خبر سُنانے اِتّی دوُر سے چل کے آئی۔

"نگمہ بھاگ کے گئی کہاں ... ؟ اُس کا ہئی کون اپنا پرایا کہ میاں سے تیزا تیزی ہوئی، برقع سنبھالا اور چل دیں ..." پٹھانی نے امّی جان کے سامنے جو مسہری پر بیٹھی ہوئی تھیں، اکڑوں بیٹھ کے کہا۔

امی جان نے کہا کہ اُن کا ماتھا تو اُسی وقت ٹھنکا تھا جب وہ مشاعرے سے نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی؛ "گھنٹے پون گھنٹے بعد لوٹی تو بدحواس سی!"

"کیوں جی ..." یکایک امی جان میری طرف مڑیں ——— میں اُن کے پاس مسہری پر لیٹا ہوا تھا: "تم کو تو وہاں کہیں نظر نہیں پڑی تھی؟"

"مجھے ... ؟" بھلے کو میرا مُنہ اُن کی طرف نہیں تھا: "نہیں تو!"

خیراتن ایک پلنگ کی نواڑ کس رہی تھی، ہاتھ روک کے بولی: "پال رکھا ہو گا کوئی یار!"

"لڑکی، آہستے بول ... میاں بیٹھک میں ہیں!" پٹھانی نے اُسے ڈانٹا۔

نگمہ پٹھانی نے، اور امّی جان نے بھی خیراتن کی رائے سے اتفاق کیا لیکن نانی اماں، جو تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے سب کو دیکھ رہی تھیں، چپ رہیں۔

میں اُٹھا اور شیروانی ڈال کر، "ابھی آتا ہوں" کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

رسوا راستے ہی میں مل گیا ——— وہ بھی سب سُن چکا تھا۔

مجھے ایک طرف لے جا کے بولا: "میں کہتا تھا نا کہ ایسی عورتوں کا کوئی اعتبار نہیں.... !کسی اور کو بھی ہلکا رکھا ہو گا!"

"مگر کسے؟"

"مجھے کیا معلوم!"

"بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"ذرا دیر کے لئے دھیان تمھاری طرف گیا تھا!"

اُسے بڑا تعجب ہوا: "مجھے کیا باؤلے کتّے نے کاٹا ہے!"

"نہیں، میرا مطلب تھا، شاید وہ خود بھاگ آئی ہو تمھارے پاس۔"

"اور میں نے اُسے چھپا لیا ہو...!" وہ ہنسا: "بھئی کمال کرتے ہو!"

سہ پہر تک تقریبًا سارا معمہ حل ہو چکا تھا، اور اس امر میں کسی تشکک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے، بس یہ طے ہونا باقی تھا کہ کس کے ساتھ۔

"سو یہ بات بھی کب تک صیغۂ راز میں رہے گی..." میں نے بیٹھک میں ابا جان کو حکیم اخلاق حسین سے کہتے سُنا، جو امّی جان کے بقول، "آج نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑے تھے!"

"سُنا ہے، کل رات پیش کار صاحب نے طلاق دے دی تھی چھنال کو...!" میں نے خیراتن کو باورچی خانے میں چھٹّن کو بتاتے سُنا۔

"پر کیوں؟"

یہ خیراتن کو معلوم نہیں تھا۔

مگر صفو ڈاکیے کو معلوم تھا ——— اُس نے مجھے گلی میں پہلے تو مبارکباد دی،

پھر ایک پارسل اور پھر بتایا، "کوٹھے میں کسی یار کو لئے پڑی تھیں کہ ماما کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے اوپر جا کر اپنی آنکھوں سے تماشا دیکھا۔۔۔ پیش کار صاحب دورے پر تھے دوسرے دن لوٹے تو ماما نے ان سے سارا ماجرا بیان کر دیا۔۔۔۔ اور وہ بھاگ لیں راتوں رات!"

لیکن پٹھانی جب اپنی گوئیاں کے ساتھ "رٹیڈ" منصف فاروق حسن کی حویلی گئیں تو ان کی بڑی بیگم نے انھیں قدرے مختلف تفصیلات بتائیں۔

پٹھانی نے آکر امّی جان کو بتایا: "بڑے میاں دورے پر نہیں گئے تھے۔۔۔۔ انہیں شبہ ہو گیا تھا۔۔ چال چلی۔۔۔۔ کہا، 'ہم دورے پر جا رہے ہیں اور دو رات کے لئے بڑی بی کو چھوڑے جا رہے ہیں۔۔۔' پر گئے دئے خاک نہیں۔۔۔۔ رات کو چپکے سے آئے اور اپنی آنکھوں سے سارا تماشہ دیکھ لیا۔۔۔ کوٹھے میں اندھیرا نہ ہوتا تو مردوئے کو بھی پہچان لیتے۔۔۔" اور وہ جلدی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر اور دوپٹہ منہ پر رکھ کر اندر ہی اندر ہنسیں، "کپڑوں بنا سب ایک سے لگتے ہیں!"

امّی جان نے بھی منہ پر دوپٹہ رکھ لیا ——— تب ان کی نظر مجھ پر پڑی اور انہوں نے کہا،

"تم یہاں کیا کر رہے ہو!"

بہشتی جب شام کو پیش کار صاحب کے ہاں پانی بھرنے آیا اور اس نے کنوئیں میں ڈول ڈالا تو یہ بھید کھلا کہ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ نہیں بھاگی ہے، بلکہ اس نے گھر کے کنوئیں میں چھلانگ لگائی ہے۔

مغرب کے بعد امّی جان نعش دیکھنے، کوٹھے کو ٹھے، پیش کار صاحب کے گھر گئیں ——— انہوں نے لوٹتے ہوئے بڑی بی کو اسی کمرے میں لے جا کر اور ڈرا دھمکا کر سب ماجرا پوچھا۔

بڑی بی نے قبولا کہ ہاں، انہوں نے چھوٹی پیش کارن کو وہیں اسی کمرے میں کسی مردوئے کے ساتھ مستیاں کرتے دیکھ لیا تھا؛ انہوں نے صرف بدنامی کے ڈر سے شور نہیں مچایا تھا اور دوسرے دن جب پیش کار صاحب دورے سے لوٹے تو انہیں سب کچھ بتا دیا تھا، ورنہ نمک حرامی ہوتی، پیش کار صاحب نے چھوٹی پیش کارن سے کہا تھا کہ وہ اسے طلاق دے دیں گے اور گھر سے نکال دیں گے، مگر وہ ایسی ڈھیٹ کہ پھر بھی اس مردوئے کا نام نہیں بتایا، اور صبح جب وہ گھر میں کہیں نہ دِکھیں تو یہی سمجھا گیا کہ اس کے ساتھ بھاگ گئی ہیں...

"کہہ رہی تھی: میری آنکھ لگ گئی..." امّی جان اندر کے آنگن میں نانی اماں کو بڑی بی کا قبولا سُنا رہی تھیں اور ان کی آواز چھت پہ آ رہی تھی، "ورنہ میں ضرور اس کا راستہ روکتی۔"

نانی اماں کی آواز بالکل نہیں آئی۔

رات کے کوئی دس بجے ہوں گے۔

میرا کسی سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا ـــــــ میں نیچے آیا۔

امّی جان اور ابّا جان، اتنی گرمی میں، اندر کی بیٹھک میں تھے ـــــــ اُن کی آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

امّی جان جھیر پھاڑ کی بات کر رہی تھیں اور ابّا جان کہہ رہے تھے کہ صرف یوسف صاحب اس معاملے میں کچھ کر سکتے ہیں۔

مجھے جھرجھُری سی آگئی۔

نانی اماں دالان میں تخت پر عشا کی نماز پڑھ رہی تھیں۔

میں جا کر مسہری پر ان کے پاس بیٹھ گیا۔

انہوں نے سلام پھیرا معمول سے زیادہ لمبی دُعا مانگی، دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے،

جا نماز تہہ کی، اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر اور آنکھیں بند کر کے وہاں چلی گئیں، جہاں اکثر جایا کرتی تھیں، کہیں بہت دور۔

جب خاصی دیر بعد واپس آئیں تو انھوں نے آنکھیں کھول کر اور کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا، "نصیبوں جلی نے کن لوگوں پہ نچھاور کر دی جان سی عزیز شے!"

انھوں نے تسبیح اٹھائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

تین چار منٹ بعد میں چپکے سے اُٹھا اور اُوپر چلا گیا۔

پچھم سے چلی پروا

لندن - ۱۹۸۶ء

سارکا (ہندی) — دہلی

نیا دور — کراچی

شب خون — الٰہ آباد

دی ٹورانٹو ساؤتھ ایشین ریویو — کینیڈا

"نیا دور" کراچی میں آپ کا افسانہ "پروائی" پڑھ کر عجیب فرحت و مسرت کا احساس ہوا کہ آپ افسانہ نگاری کی طرف پھر مائل ہیں۔ میں نے "پروائی" کی نقل بنوا کر "شب خون" میں اشاعت کے لئے دے دی۔

شمس الرحمٰن فاروقی

"پروائی" بہت اچھا.......... تہہ دار افسانہ ہے۔

جمیل جالبی

یہ افسانہ بے حد COMPACT ہے....... بے حد خوبصورت افسانہ ہے۔ آپ نے ابہام سے خوب کام لیا ہے۔

محمد عمر میمن

لڑکے نے کاپی پر سے نظریں ہٹا کر بند دروازے کی طرف دیکھا جس کے پیچھے اس کا باپ کپڑے بدل رہا تھا۔

"آئیں ابّا پروا کسے کہتے ہیں؟"

مگر جواب باورچی خانے میں سے آیا، جہاں ماں ناشتے کے پراٹھے تل رہی تھی۔

"پروائی کو۔"

"یانی وہ ہوا جو مشرق کی طرف سے چلتی ہے؟"

"نہیں۔" ماں نے پراٹھے توے پر سے بھگونے میں اتارتے ہوئے کہا۔ "جو مشرق یعنی پورب کی طرف سے چلتی ہے۔ پورب۔ پریا۔ پروا۔ پروائی۔"

"پرویا بھی کہتے ہیں۔"

باپ دروازہ کھول کر قمیص کے بٹن بند کرتا دالان میں آیا جہاں ایک گول میز کے گرد، جس پر پلاسٹک کا ایک میلا میز پوش بچھا ہوا تھا۔ ایک تین ٹانگ کی اور تین سالم کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے ایک پر لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میز پر کتابوں کا ایک بستہ کھلا پڑا تھا۔ وہ ایک کاپی پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔

باپ نے بائیں آستین کا بٹن بند کرنے کے بعد پوچھا۔

"کیوں؟"

"جملہ بتاتا ہے۔"

"کیا جملہ بنایا؟" باپ نے بائیں ہاتھ سے دائیں آستین کا بٹن بند کر کے پوچھا۔

لڑکے نے کاپی آہستہ سے باپ کی طرف کھسکا دی۔

"ہوا مشرق کی طرف سے چل رہی ہو تو اُسے پروا کہتے ہیں۔" باپ نے کاپی پر جھک کر پڑھا۔ "یہ تو معنیٰ ہوئے!"

"پھر؟" لڑکے نے سر کھجایا۔

ماں ایک پلیٹ میں ایک پراٹھا اور تھوڑا سا خاگینہ لیے آ گئی، اور پلیٹ لڑکے کے سامنے رکھ کر بولی۔

"لکھو۔"

لڑکا پھر کاپی پر جھک گیا۔

"پروا میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ اداس سے اداس شخص بھی تھوڑی دیر کے لئے خوش ہو جاتا ہے۔ اور ....."

لڑکے نے کاپی پر سے نظریں ہٹا کر ماں کی طرف دیکھا۔

ماں نے قدرے توقف کیا۔

"اتنا کافی ہے۔ 'اور' کاٹ دو۔"

لڑکے نے "اور" کاٹ دیا۔

ماں تیزی سے باورچی خانے میں واپس چلی گئی جو دالان سے ملحق تھا اور جس کا دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔

لڑکے نے کاپی بند کر کے بستے میں رکھی، بستہ بند کیا اور جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگا۔ پھر اس نے باورچی خانے کے دروازے کے پاس صحن میں رکھی ٹنکی کا نل کھول کر کلی کی۔ الگنی پر لٹکی ہوئی تولیہ سے ہاتھ اور منہ پونچھا۔ بستہ گلے میں ڈالا۔ ماں سے

کہا۔ "شام کو دیر سے آؤں گا امی۔ ہاکی کا میچ ہے!" اور "خدا حافظ" کہتا صحن کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد بیوی ایک اور پلیٹ میں دو پراٹھے اور رات کا بچا ہوا تھوڑا سا سالن لیے آئی۔ اس نے پلیٹ میاں کے سامنے رکھ دی، جو اب اُس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جس پر پہلے بیٹا بیٹھا ہوا تھا۔ میاں نے پلیٹ کو گھورا۔

"خاگینہ نہیں ہے؟"

"ایک ہی انڈا تھا۔" بیوی نے باورچی خانے کی طرف واپس جاتے ہوئے کہا۔ "شام کو لیتی آؤں گی۔ آج تنخواہ کا دن ہے۔"

باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر اس نے بھگونے میں سے ایک باسی روٹی نکالی اور دیگچی میں بچے ہوئے سالن میں ڈبو ڈبو کر آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ مگر تین چار نوالے کھانے کے بعد اس نے باقی روٹی واپس بھگونے میں رکھ دی۔

"تم نہیں کرو گی ناشتہ؟" میاں نے آخری نوالے سے پلیٹ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"کر لیا۔" بیوی نے کیتلی چولھے پر سے اتار کر اس میں سے کھولتا ہوا پانی چائے دانی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"کب؟"

"جب آپ نہا رہے تھے۔"

میاں نے چائے کی پیالی میں چمچہ چلنے کی آواز سنی۔

"چائے تو ملے گی یا۔؟"

جواب میں بیوی طشتریوں پر رکھی چائے کی دو پیالیاں لیے آئی۔ اور ایک میاں کے اور ایک اپنے سامنے رکھ کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میاں نے ایک گھونٹ لیا اور کلمے کی انگلی سے میز پوش پر پڑا ہوا دال کا ایک پیلا دھبّہ مٹانے لگا۔

بیوی نے بھی ایک گھونٹ لیا۔

"دھو دوں گی۔"

تھوڑی دیر دونوں گھونٹ گھونٹ چائے پیتے رہے۔ پھر میاں نے کہا۔

"دو دن سے یہی قمیص پہن رہا ہوں!"

"دھوبی بدلنا پڑے گا۔ کبھی وقت پر نہیں آتا۔"

"دو ایک قمیصیں تو گھر پر بھی دُھل سکتی ہیں۔"

"کیوں نہیں!" پیالی کا پیندا طشتری سے ٹکرایا۔" بلکہ ساری دُھلائی گھر پر ہو سکتی ہے۔"

میاں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ارے تم تو ناراض ہو گئیں۔"

بیوی چپ رہی۔

میاں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اُسے سہلانے لگا۔

بیوی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

میاں اٹھا اور جا کر اس کی کرسی کے پیچھے اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس کے بدن اور اس کی بیوی کی پیٹھ کے درمیان صرف کرسی کی پشت تھی۔ اس نے اپنی ہتھیلیاں بیوی کے زرد رخساروں پر رکھ دیں۔ اور جھک کر ہونٹوں سے اس کے میلے بالوں کو چھوا۔ پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی بیوی کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر پھیری اور پھر اس کے دونوں ہاتھ بیوی کے کھلے بالوں پر سے پھسلتے ہوئے اس کے کندھوں پر آئے اور کچھ دیر وہاں ٹھہرے رہنے کے بعد نیچے کی طرف سرکے۔

بیوی تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ابھی بہت سے کام باقی ہیں ۔۔۔۔"

میاں کے چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"۔۔۔۔ برتن دھونے ہیں۔ بستر ٹھیک کرنے ہیں۔ نہانا ہے ۔۔۔"

میاں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیوی کو بٹھا دیا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں!" بیوی نے اپنے نیل پالش سے عاری ناخونوں پر نظریں جما کر کہا۔

"ادھر دیکھو۔"

مگر بیوی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"یہ بھی کوئی وقت ہے!"

"اور کل رات؟"

"سر میں درد ہو رہا تھا۔"

میاں طنزیہ ہنسی ہنسا۔

"بہانے کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔"

بیوی نے چائے کی پیالیاں اٹھائیں اور باورچی خانے کی طرف چلی۔

اور اس کے متحرک کولھے ساری کی اوٹ سے میاں سے چشمکیں کرتے ہوئے باورچی خانے کے سرمئی اندھیرے میں گم ہو گئے۔

وہ دکان سے اتری تو اس نے دیکھا کہ سڑک کے اس پار ایک کار آ کر رکی جسے ایک شوفر چلا رہا تھا اور جس کی پچھلی سیٹ پہ ایک شخص سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے

بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹھکی۔ شوفر نے باہر آکر پیچھے کا وہ دروازہ کھولا جو سڑک کی طرف تھا۔ وہ فٹ پاتھ پہ لگے ہوئے پیڑ کی آڑ میں ہو گئی۔ پچھلی سیٹ پہ بیٹھا ہوا شخص باہر آیا۔ لمبا قد۔ گیہواں رنگت۔ سوٹ اور ٹائی، جوتے چمکتے ہوئے۔ شوفر سے دو ایک باتیں کرنے کے بعد وہ شخص پاس کی ایک گلی میں چلا گیا۔ اور شوفر پھر جا کر کار میں بیٹھ گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کا گلا سوکھ رہا ہے۔ پیر بھاری ہو گئے ہیں، ماتھے پہ پسینے کا لیپ ہو رہا ہے۔ آنکھیں اپنے حلقوں سے نکل کر اس گلی میں جانا چاہتی ہیں جس میں وہ شخص گیا ہے۔ اس نے دو ایک بار تھوک نگلا۔ ماتھے پہ ہاتھ پھیرا سر پہ ہاتھ پھیرا۔ ساری کا پلو شانے پر سے اٹھا کر سر پہ ڈالا۔ پیڑ کی آڑ سے نکلی۔ سڑک پار کرنے کے لئے بڑھی مگر رک گئی۔ چند لمحے کار کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر جلدی سے سڑک پار کر کے کار کے پاس پہنچی اور شوفر سے کوئی دو فٹ کے فاصلے پہ ایسے رکی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہو کہ رکی رہے یا آگے بڑھ جائے۔

شوفر نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

شاپنگ بیگ پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ مگر دس بارہ قدم چل کر واپس آگئی۔

اس بار شوفر نے صرف اس کے چہرے پہ نظر ڈالی۔

ایک لمبا سانس لے کر وہ کار کے بالکل قریب پہنچ گئی۔

"یہ کون صاحب تھے؟" اس نے شوفر سے ایسے پوچھا جیسے کوئی راہ چلتا کسی دوسرے راہ چلتے سے راستہ یا وقت پوچھتا ہے۔

شوفر نے پھر اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

"ہمارے مہمان!"

"آپ کے؟"

"ہاں۔ ہمارے صاب کے۔ پاکستان سے آئے ہیں۔"

وہ چند لمحے چپ کھڑی رہی۔

"ان کا نام مسرور احمد ہے نا؟"

شوفر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس نے پھونک مار کر ماچس بجھائی اور بجھی ماچس کھڑکی کے باہر پھینکی جو اس کی چپل کے پاس آکر گری۔

"پتا نہیں جی صاب تو قاضی جی کہتے ہیں۔"

"قاضی مسرور احمد۔" اس نے گویا اپنے آپ سے کہا۔ "ان کا پورا نام قاضی مسرور احمد ہے۔"

"شاید!"

اور وہ سامنے کے شیشے میں سے تنگ کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکی کو کار کے سامنے سے گزرتا دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

پاس سے ایک کار گزری، اس نے دیکھا کہ کار ایک لڑکی چلا رہی ہے۔ اس کے پاس سامنے کی سیٹ پہ ایک اور لڑکی بیٹھی ہے جس کے بال ہوا میں اُڑ رہے ہیں اور پچھلی سیٹ پہ ایک دُبلا مرد اور ایک موٹی عورت۔ اس نے چپل سے ماچس کا جلا ہوا سرا ملا، شاپنگ بیگ کھول کر اس میں جھانکا۔ مڑی اور کار کے پیچھے سے ہوتی ہوئی کار کی دوسری طرف کپڑوں کی ایک دکان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اسی راستے شوفر کی طرف واپس آئی اور اس نے اس سے ایسے پوچھا جیسے کوئی بچہ کوئی ایسی فرمائش کر رہا ہو جس کے پوری ہونے کی اُسے بہت کم امید ہو۔

"ان کی بیگم صاحبہ بھی ساتھ ہیں؟"

شوفر نے اُسے ایسے دیکھا جیسے سر راہے لوگ پاگلوں۔ مجذوبوں یا سر پھروں کو دیکھتے ہیں۔ اسے اس کا واپس آ کر مزید سوال کرنا اچھا نہ لگا مگر تربیت یافتہ تھا نرمی سے بولا۔

"بیگم صاحب! نہیں جی۔ قاضی صاحب ابھی چھوٹے ہیں۔"

اس نے جلدی سے "شکریہ" کہا۔ مڑ کر گلی پر نظر ڈالی۔ اور ہلکے مگر تیز قدم اٹھاتی بس کے اڈے کی طرف چل دی۔

باپ فائلوں کا پلندہ لئے گھر میں داخل ہوا تو لڑکا میز پر بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا۔ اس نے پلندہ میز پر رکھ دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"امّی کہاں ہیں تمھاری؟"

"نہا رہی ہیں۔"

غسل خانے میں سے جو باورچی خانے سے ملحق تھا چھل چھل کی آواز آئی۔

"اس وقت؟"

لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

باپ کی نظر میز پوش کے پلاسٹک پر پڑی جو چم چم کر رہا تھا۔ دالان کا فرش اُسے ایک دو جگہ سے گیلا نظر آیا۔ شاید دھویا گیا ہے۔ اس نے سوچا صحن کا فرش بھی جگہ جگہ سے گیلا تھا۔ گھر میں صرف تین کمرے تھے اور تینوں کے دروازے دالان میں کھلتے تھے۔ اس نے پہلے ایک دروازے پر نظر ڈالی۔ پھر دوسرے اور پھر تیسرے پر۔ تینوں صاف تھے اور جھاڑے پونچھے گئے ہیں۔ اس نے اندازہ لگایا بغیر شیڈ کا وہی ایک بلب عین میز کے اوپر لٹکا ہوا تھا اور اس پر بدستور گرد

جمی ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے بلب زیادہ روشنی دے رہا ہو۔
چھل چھل کی آواز بند ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد غسل خانے کا دروازہ کھلا اور بیوی دھانی رنگ کا کھڑا پاجامہ اور راسی رنگ کا کُرتہ پہنے اور سر سے تولیہ لپیٹے باہر آئی۔
"بہت دیر ہو گئی آج!" اس نے میاں کے پاس رُک کر کہا۔ "چھ بجے کی بس چھوٹ گئی تھی۔"
اس کے بدن سے سوگندھ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے گالوں پر گلابی لالی پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں دالان کی چھت کا بلب قمقمے روشن کر رہا تھا۔
"صبح نہیں نہائی تھیں؟" میاں نے اس کے گالوں پر سے اپنی نظریں نوچتے ہوئے پوچھا۔
"دیر ہو گئی تھی۔"
وہ اس دروازے کی طرف بڑھی جس میں سے صبح میاں قمیص کے بٹن بند کرتا باہر آیا تھا تو میاں نے کہا۔
"ایک پیالی چائے ملے گی؟"
"ذرا بال سکھا لوں۔ پھر۔"
یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلی گئی۔ اور میاں نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیا نکالی اور سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔
لڑکے نے ہوم ورک ختم کیا اور کتاب، کاپی اور قلم اٹھا کر بیچ والے کمرے میں چلا گیا۔
میاں نے آخری کش لے کر سگریٹ کو جوتے سے مسلا اور اٹھا چاہتا تھا کہ بیوی کمرے سے باہر آئی۔ اس کے بال اب تولیہ کی قید سے آزاد اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ سینے پر چپنے ہوئے دوپٹے کی لہریں منجمد تھیں۔ اس کے ہاتھ

میں گیلا تولیہ تھا جسے آنگن میں جا کر اس نے الگنی پر پھیلا دیا۔ پھر وہ باورچی خانے کی طرف بڑھی۔

"امی!" ۔ بیچ کے کمرے میں سے لڑکے کی آواز آئی۔

وہ رُک گئی۔

"کیا ہے منّے؟"

"بھوک لگی ہے۔"

"اچھا۔"

"اس نے کھانا نہیں کھایا ابھی تک؟" باپ نے پوچھا۔

ماں نے نفی میں جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اسکول سے آتے ہی چائے کے ساتھ دو توس کھالئے تھے۔ کہہ رہا تھا بھوک نہیں لگی ہے۔"

لڑکا کمرے سے باہر آگیا۔

"امّی کھانا!"

"اے ہے منّے! ایسی بھی کیا بے صبری ہے۔ پہلے آپا کے لئے چائے بنا دوں۔ پھر دوں گی۔"

لڑکا پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماں باورچی خانہ میں چلی گئی۔ اور باپ نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو۔"

"کیوں؟"

"مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا کھا لیتے ہیں۔"

باورچی خانے سے کھڑ پڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ لڑکے نے ریڈیو آن کر دیا۔ اور باپ کمرے میں جاکر کپڑے بدلنے لگا۔ کپڑے بدل کر غسل خانے میں گیا۔ اتنے میں ماں نے میز پر پہلے پلیٹیں لگائیں۔ پھر ایک پانی بھرا جگ اور تین گلاس لاکر رکھے اور پھر کھانا لگا دیا۔

"آ جاؤ، کھانا لگ گیا" اس نے بیچ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا

لڑکا ریڈیو بند کرکے دالان میں آیا تو اس کی نظر میز کے وسط میں رکھی ہوئی قاب پر پڑی۔

"اخاہ! آج تو پلاؤ پکا ہے!"

"پلاؤ!"

میاں نے۔ جو الگنی پر پھیلی گیلی تولیے سے ہاتھ منہ پونچھ کر اب دالان میں تھا۔ پہلی کرسی پر بیٹھتے ہوئے قدرے حیرت سے کہا۔

بیوی نے اس کی طرف قاب بڑھائی۔

"آج جلدی چھٹی مل گئی تھی۔ سوچا کوئی خاص چیز پکا لوں"

میاں نے پہلے پلاؤ لیا۔ پھر اس پر رایتا ڈالا۔ ماں نے جو پلاؤ قاب میں رہ گیا تھا اس کا آدھے سے زیادہ حصہ لڑکے کی پلیٹ میں ڈالا اور باقی اپنی پلیٹ میں لے کر رایتے کا ڈونگا لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکے نے تھوڑا سا رایتا پلاؤ پر ڈالا۔ اور پھر ڈونگا ماں کے سامنے رکھ دیا۔

"اچھا بنا ہے" میاں نے پہلا نوالہ کھانے کے بعد کہا۔

"ہوں" لڑکے کے نوالہ بھرے منہ سے آواز آئی۔

ماں مسکرائی۔

جب کھانا ختم ہو گیا اور پلیٹیں وغیرہ ہٹا دی گئیں تو بیوی نے باورچی خانہ

سے لاکر پیٹھے کا ایک ڈبہ میز پر رکھ دیا۔

"واہ بھئی!" میاں نے ڈبہ کھولتے ہوئے کہا۔ "آج تو، بقول شخصے، عیش ہو گئے۔ تنخواہ بڑھی ہے کیا؟"

اور اس نے ڈبّے میں سے ایک گلاب جامن اُٹھائی۔

"نہ کہیں۔" بیوی نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "منا کئی دن سے مٹھائی مٹھائی کر رہا تھا۔ سوچا لیتی چلوں۔" اس نے لڑکے سے کہا۔ "لو!"

لڑکے نے ایک لڈو اٹھالیا۔

باپ نے بھی ایک لڈو اٹھایا۔

ماں نے ہری برفی کا ایک ٹکڑا لیا۔

پھر لڑکے کا ہاتھ گلاب جامن کی طرف بڑھا۔ مگر گلاب جامن منہ میں ڈالنے سے پہلے اس نے کہا۔

"امی۔ سراج صاحب کے رہتے بھتے پر وائی کی ایک اور تاثیر بھی ہوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ماں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ کیا؟" باپ نے پوچھا۔

"وہ کہ رہے بھتے جب پروائی چلتی ہے تو پرانی چوٹوں میں درد ہوتا ہے۔ سچ مچ؟"

ماں نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں۔"

"اور لو۔" میاں نے ڈبہ بیوی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

بیوی نے کہا۔ "بس بس۔"

کوئی تیس چالیس منٹ بعد بیوی باورچی خانے میں گئی مگر فوراً ہی واپس آگئی۔

"صبح دھوؤں گی۔"

میاں ایک کھلی فائل پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھائے بغیر کہا "ہاں"۔

تھوڑی دیر بعد ماں لڑکے کے کمرے میں گئی۔

"سو رہا ہے۔" اس نے واپس آکر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میاں نے پھر فائل پر سے سر اٹھائے بغیر "ہاں" کی۔

تھوڑی دیر بعد بیوی اپنے کمرے میں گئی اور ایک رسالہ پڑھنے لگی۔ مگر جب میاں نے سامنے کی فائل بند کر کے ایک طرف کھسکائی اور وہ فرش پر سے ایک اور فائل اٹھانے کے لئے جھکا تو اس نے کنکھیوں سے دیکھا کہ بیوی کی نظریں رسالے پر نہیں۔ آنگن میں چھائے اندھیرے پر جمی ہیں۔ لیکن جب اس نے سگریٹ سلگانے کے لئے سر اٹھایا تو بیوی کو پھر رسالہ پڑھتے پایا۔ بیوی نے رسالے پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ مسکرائی اور پھر رسالہ پڑھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ رسالہ بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تو اب لیٹتی ہوں۔"

"تم جاؤ مجھے ابھی تھوڑا ٹائم اور لگے گا۔"

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی جہاں سے کچھ دیر تک گنگنانے کی آواز آتی رہی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔

اور جب آنگن آسمان سے برستے ہوئے گیلے اور گاڑھے اندھیرے سے اٹ گیا۔ اور جب باہر سڑک پر ٹریفک کی آوازیں کم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں اور جب کہیں دور سے ایک کتے کے رونے کی آواز آئی اس وقت اس نے آخری فائل بند کر کے ایک کے اوپر ایک رکھی ہوئی باقی فائلوں پر رکھی۔ آنکھیں ملیں۔ سگریٹ سلگائی۔ کھڑا ہوا۔ دالان کے بلب کا سوئچ آف کیا۔ اور آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔

سامنے دو پلنگ بچھے ہوئے تھے جن کے سرہانے دیوار سے لگے ہوئے تھے، پلنگوں

کے بیچ میں دیوار سے لگی ایک چھوٹی سی تپائی پر ایک چھوٹا سا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا جس کا کپڑے کا پیلا شیڈ کمزور بلب کی روشنی کو پلنگوں کے بالائی حصوں سے آگے نہیں بڑھنے دے رہا تھا۔

دائیں ہاتھ کے پاس والے پلنگ پر بیوی سو رہی تھی۔ پلنگ کے پاس دائیں جانب ایک آرام کرسی پر اُسے وہ پاجامہ۔ کرتا اور دوپٹہ بے ترتیبی سے پڑا نظر آیا جن میں ڈھائی تین گھنٹے پہلے بیوی کو دیکھ کر وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکا تھا۔ اور ایک باڈی بھی۔ اُسے تعجب ہوا کیوں کہ بیوی جب بھی کپڑے بدلتی تھی تو اُتارے ہوئے کپڑے سلیقے سے تہہ کر کے الماری میں رکھ دیا کرتی تھی۔

آگے بڑھ کر اس نے وہ دولائی اٹھائی جو پیروں سے کندھوں تک بیوی کے بدن کو ڈھانکے ہوئے تھی۔ اور وہ دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ شرم و حیا کی پابندیوں سے بیگانہ ایک سویا جسم کسی کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس جسم کو پہلی بار دیکھ رہا ہے۔

اس نے جلدی سے سگریٹ بجھائی اور آہستہ سے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ بیوی کنمنائی اور اس کا چہرہ جو تھوڑا سا آرام کرسی کی طرف مڑا ہوا تھا سیدھا ہو کر لیمپ کے شیڈ میں سے چھنتی ہوئی روشنی کی لپیٹ میں آگیا اور میاں کے دیکھتے دیکھتے ایک ہلکی سی مسکراہٹ بیوی کے بند ہونٹوں پر پھیل گئی۔

وہ ایک ہاتھ بیوی کے سر کے نیچے رکھے ہوئے تکیئے پر اور دوسرا اس تکیئے پر رکھ کر جو اس کی بغل سے لگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھکا۔ مگر اس کے کھلے ہونٹ بیوی کے بند ہونٹوں کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ اُسے گمان گزرا کہ بیوی کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ پھر اسے اس کے سر کے پاس تکیئے پر ایک گیلا دھبّہ نظر آیا اور اس کا گمان یقین میں بدل گیا۔

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور کچھ دیر تک بیوی کے چہرے اور اس کی جانب نگراں سینے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بہت آہستہ سے انگشت شہادت بیوی کے بند ہونٹوں پر پھیری۔ بیوی کے سانس کی رفتار بدلی۔ اس کے سینے کا زیر و بم بدلا اور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی۔ میاں نے دم سادھ کر چند لمحے انتظار کیا اور جب سانس کی رفتار اور سینے کا زیر و بم پھر ہموار ہو گیا تو وہ بڑی احتیاط سے اُٹھا۔ تھوڑی دیر خالی خالی نظروں سے بستر پر دراز لو دیتے ہوئے بدن کو دیکھتا رہا اور پھر بیوی کے اترے ہوئے کپڑے تہہ کرنے لگا۔ دوپٹا۔ کرتہ۔ پاجامہ اور باڈی اس نے تہہ کر کے آرام کرسی پر رکھے اور جا کر دوسرے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد بیوی نے کروٹ بدلی۔ اب اس کا چہرہ میاں کی طرف تھا۔ کسی رسیلے خواب کی خبر دیتی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں اور اس کی آنکھوں کے گوشوں سے کرن کرن پھوٹ کر اس کے گالوں کی لالی کو ہوا دے رہی تھی اور اس نے دوسرا تکیہ بھینچ کر سینے سے لگا رکھا تھا۔

میاں نے ہاتھ بڑھا کر دولائی سے بیوی کی عریانی کو ڈھانکا۔ ٹیبل لیمپ بجھایا اور لیٹ گیا۔

صراطِ المستقیم

نئی دہلی اور کراچی ۔ ۵۷-۱۹۵۶ء

نیا دور ۔ کراچی

ا..... افسانہ ختم کر لینے کے بعد مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ جیسے ادیبوں کو پیدا فرما کر گویا کہ مسلم قوم کے مستقبل کی ٹمٹماتی شمع میں، جس کا تیل ختم ہونے کو تھا اور جو گل ہونے کے قریب تھی۔ نیا تیل ڈال کر از سرِ نو روشن کر دیا۔ خدا آپ کو اور اتنی قابلیت عطا فرمائے کہ آپ اپنے قلم سے۔ قل۔ لا الٰہ الا اللہ۔ و۔ محمد الرسول اللہ کی تبلیغ کریں اور یہ کہ آپ کا قلم معاونِ قوم ثابت ہو۔ آمین !!!!

ڈھاکہ سے ایک قاری کا خط

شرمندہ ہوں میں اپنے فسانے کے سامنے (ضؔ)

یہ ان دِنوں کی بات ہے جب میرے ختنے ہوئے تھے۔ میری عمر اس وقت چار برس کی ہوگی۔ میری یادداشت میں یہ سنت والا واقعہ اس عمر کا واحد نمائندہ ہے۔ مجھے اس کی تمام تفصیلیں ابھی تک بخوبی یاد ہیں۔ کیسے مجھے چوکی پر بٹھایا گیا۔ کیسے سونے کی چڑیا اڑائی گئی۔ کیسے چوکی سے اٹھا کر مجھے بستر پر ڈالا گیا اور کیسے مجھے خوش کرنے کے لئے سب نے ـــــ ابّا جان اور امّی جان نے اور ان سب تمام عزیزوں نے جو اس تقریب پر جمع ہوئے تھے ـــــ روپے دیئے۔ کاغذ کے نہیں، چاندی کے، جنہیں میں نے سنبھال کر تکئے کے نیچے رکھ چھوڑا تھا اور جنہیں میں بار بار تکئے کے نیچے سے نکال کر ہاتھوں میں لے کر اُچھالتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

سونے کی چڑیا اڑے دوسرا یا تیسرا دِن تھا کہ دو روپے میرے ہاتھ سے اچھل کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ نانی کی ہدایت کے مطابق اناللہِ و انا الیہ راجعون پڑھ پڑھ کر ان روپیوں کی تلاش کی گئی۔ اس دالان کا کونہ کونہ چھان مارا گیا جس میں میرا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ تلاش کرنے والوں کی زد سے صحن بھی نہ بچ سکا۔ اور ایک نظر صحن کی نالی پر بھی ڈالی گئی مگر روپیوں کے تو گویا پَر لگ گئے تھے۔

ابّا جان نے میرا خسارہ پورا کرنے کے بعد لگ بھگ آدھ گھنٹے تک اپنی زندگی کے وہ مختلف واقعات سنائے جن میں روپیہ ایک مرتبہ کھویا تو پھر کبھی نہیں ملا۔ بیسہ، ادھنا اکنی، دونی، چونی اور اٹھنی کھو جائے تو مل جاتی ہے مگر روپیہ ـــ چاندی والا روپیہ ـــ

کھو جائے تو پھر ملنا محال۔ یہ ابّا جان کی رائے تھی جس کی بنیاد ان کے ذاتی تجربات پر تھی۔ نانی بھی ان سے متفق تھیں۔ اور ان کا خیال تھا کہ چاندی کے روپیوں میں چوہوں کے لئے کوئی خاص کشش ہوتی ہے۔ جیونہی روپیہ نظر بچا کر بھاگا چوہے نے بل سے نکل کر اُسے منہ میں دبایا اور غڑاپ سے واپس اپنے بل میں، ایک دفعہ ایک مکان کی بنیاد رکھی جارہی تھی۔ اس سلسلے میں کھدائی کی گئی تو چوہوں کے ایک بل میں سے پانچ چاندی کے روپے نکلے یہ واقعہ نانی نے بیان کیا۔ اور سب نے اسے بڑے انہماک سے سنا۔ اور سب نے اس سلسلے میں کسی نہ کسی رائے کا اظہار کیا۔ سوائے امّی جان کے جو چُپ رہیں۔

وہ بولیں تو دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد جب سنّت کی تقریب کے سلسلے میں آئے ہوئے مہمان جن میں خالہ جان بھی شامل تھیں، رخصت ہو چکے تھے۔ کہنے لگیں روپے نہ کھوئے اور نہ انہیں چوہے لے گئے۔

تو پھر کہاں گئے؟

خالہ جان کی جیب میں یا ان کے تنگ پاجامے کے نیفے میں اور ان روپیوں سے خالہ جانی اپنی بیٹیوں کے لئے ہیزلین اسنو۔ اور پاؤڈر خریدیں گی۔

ابّا جان نے امّی جان کی بات کو ہنس کر ٹال دیا۔ ان کا خیال تھا کہ امّی جان کو خالہ جانی سے بغض للّٰہی ہے تبھی تو وہ ان پر اس قسم کا رکیک شبہ کرتی ہیں۔ مگر امّی جان اپنی بات پر اڑی رہیں۔ انہیں شبہ نہیں یقین تھا۔

نانی نے امّی جان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے وہ شبہ کی حد سے آگے نہیں بڑھیں حالانکہ بقول ابّا جان کے انہیں بھی خالہ جانی سے بغض للّٰہی تھا۔

ان تین بڑوں کے درمیان اس روز اور اس کے بعد خالہ جانی کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو گفتگو ہوئی اس سے مجھے پتہ چلا کہ خالہ جانی امّی جان کی سگی بہن نہیں ہیں۔ نہ جانے کیوں میں سمجھتا تھا کہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ دونوں کا رشتہ یہ تھا کہ نانا مرحوم کے رشتے کے

کے ایک بھائی تھے جن کی ایک رشتہ کی بہن تھیں اور خالہ جانی ان کی لڑکی تھیں۔ انکی پرورش نانا مرحوم نے کی تھی۔ اس لئے امّی جان اور خالہ جانی کا بچپن سے ساتھ رہا تھا۔ حالانکہ امّی جان اُن سے کئی سال چھوٹی تھیں۔ دونوں کی تعلیم عمر کے اس فرق کے باوجود ساتھ ساتھ ہوئی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ امّی جان نے تعلیم میں جتنا جی لگایا اتنا خالہ جانی نے چھُپ چھُپ کر ناول پڑھنے میں اور امّی جان جتنی دیر ایک امریکن مشنری عورت سے سی۔ اے۔ ٹی کیٹ اور آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ پڑھتی رہتی تھیں۔ خالہ جانی اُس گوری چمڑی کی عورت کا مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ اور اُس کے جانے کے بعد بڑے انہماک سے اُس کے بالوں۔ اُس کی پوشاک اُس کے اندازِ گفتگو اور اُس کے طرزِ رفتار کی چھپ چھپ کر نقل کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں انہیں محلے اور پڑوسیوں کے لڑکوں کے ساتھ لڑکوں کے کھیل کھیلنے کا بھی بہت شوق تھا۔ پتنگ اڑاتی تھیں۔ گولیاں کھیلتی تھیں۔ پیڑوں پر چڑھنے کی کوشش کرتی تھیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی تعلیم بند کر دی گئی اور انہیں گھر کے کام پر لگا دیا گیا۔ پہلے سینے پرونے اور کاڑھنے کا کام دیا گیا اور جب انہوں نے اس طرف بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی تو انہیں بقول نانی "چولہے میں جھونک دیا گیا" جس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں باورچی خانے کے کام پر لگا دیا گیا۔ مگر باورچی خانے میں بیٹھ کر یا تو قبول عام عشقیہ غزلیں گنگنایا کرتیں یا باورچی کو بلا وجہ ڈانٹا ڈپٹا کرتیں اور اس پر رعب جمایا کرتیں یا کبھی کبھی اس سے ہنسی ٹھٹھول کرتیں۔

نانا مرحوم نے جنہیں میں نے دیکھا تو نہیں مگر جن کے بارے میں نے سنا ہے لمبی سی داڑھی تھی۔ خالہ جانی کی شادی کے بارے میں اتنی عجلت برتی کہ ابھی وہ بہ مشکل پندرہ برس کی تھیں کہ ان کا بیاہ اپنے رشتے کے ایک بھائی کے لڑکے سے کر دیا جن کی عمر اس وقت چوبیس پچیس برس کی تھی جو قرآن حفظ کر چکے تھے اور جن کے چہرے پر داڑھی تھی۔

اُن دنوں اُن کی داڑھی کالی رہی ہو گی مگر جب میں نے ہوش سنبھالا تو یہ تین چوتھائی سپید ہو چکی تھی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ اپنی داڑھی کی مکمل سیاہی سے لے کر تین چوتھائی

پسیدی تک انہوں نے کیا کچھ کیا اور کہاں کہاں رہے مگر مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان دنوں وہ "ریلوئی" کی مسجد میں امام تھے۔ پتہ نہیں یہ "ریلوئی" خالہ جانی کی ایجاد ہے یا کسی اور کی۔ مگر میں نے ریلوے کی یہ بگڑی ہوئی حالت انہی کے منہ سے سنی۔ "ریلوئی" کی مسجد میں امام مقرر ہونے سے پہلے وہ اسی "ریلوئی" میں ملازم تھے۔ ان کا کام کیا تھا۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر اتنا پتہ ہے کہ تنخواہ قلیل تھی جو امام ہونے کے بعد شاید قلیل تر ہو گئی تھی۔

اس قلت کے پیشِ نظر ان کے گھر کا رکھ رکھاؤ حیرت انگیز تھا۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ ایک کمرہ۔ ایک صحنچی۔ ایک کوٹھری۔ ایک دالان در دالان اور ایک کمرے نما کوٹھا۔ مگر کیا حسن انتظام اور کیا سلیقہ تھا۔ خالہ جانی کا کہ اس پرانی وضع کے بے ڈھنگے سے گھر میں ہر چیز پر ڈھنگ اور سلیقے کی مہریں ثبت تھیں۔ میں نے صرف خالہ جانی کے سلیقے اور حسن انتظام کا ذکر اس لئے کیا کہ ان کے شوہر کا جنہیں ہم لوگ نہ معلوم کس رشتے سے ماموں کہتے تھے۔ اس گھر سے بظاہر اجنبیوں کا سا تعلق تھا۔ وہ یا تو بسلسلۂ امامت گھر سے باہر رہتے یا گھر کے کسی کونے میں پڑے رہتے۔ بہت کم گو تھے جس کی وجہ سے اُن کی موجودگی کا احساس ویسے بھی مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ مزید برآں گھر کی آرائش کچھ اس ڈھب کی تھی کہ اس کا تعلق اُن سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مس کجن کی فریم کی ہوئی تصویر۔ طاقوں میں رکھے ہوئے پوڈر کے ڈبے۔ کریم کی شیشیاں ناخونوں کی پالش، آئینہ، سرمہ دانی۔ کنگھیاں اور کنگھے۔ ان چیزوں سے بھلا ماموں کا کیا تعلق ہو سکتا تھا جو حافظِ قرآن تھے۔ جن کی داڑھی تھی اور جو "ریلوئی" کی مسجد میں امام تھے۔

اگر کسی غیر جانبدار شخص سے کہا جاتا کہ وہ خالہ جانی کے گھر اور ہمارے گھر کا مقابلہ کرے تو بلاشبہ فیصلہ خالہ جانی کے گھر کے حق میں ہوتا۔ وہاں نہ تو باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوتا۔ نہ گھڑوں پر کائی جمی ہوتی۔ نہ چارپائیوں پر کھلے ہوئے بستر دن بھر دھوپ میں سوکھا کرتے۔ نہ پان کی پیک کے نشان فرش اور دیواروں پر گلکاریاں کرتے۔ نہ لوٹے

صحن میں اوندھے پڑے ہوتے۔ نہ میزوں اور تختوں پر سیاہی کے دھبے کسی کا منہ چڑاتے اور نہ ـــ ایک لمبی فہرست ہے۔ کیا کیجیے گا گن کر۔ بس اتنا کہنا اور ضروری ہے کہ یہ فہرست میرے گھر کی ہے جو خالہ جانی کے گھر سے کم از کم پانچ گنا بڑا تھا اور جس کے کمانے والے کی آمدنی ماموں کی آمدنی سے کم از کم پچاس گنا زیادہ تھی۔

بچپن میں ہم لوگ ـــ میں اور میرے بھائی ـــ جب گلی ڈنڈا، کبڈی یا گولیاں کھیلتے کھیلتے خالہ جانی کے گھر میں گھس جاتے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے دھوپ میں جھلس رہا تھا کہ سایہ مل گیا۔ دالان میں تخت پر گاؤ تکیے کا سہارا لئے خالہ جانی بیٹھی ہیں۔ ایک کلا پان سے بھرا ہوا ہے۔ پاس کے پلنگوں پر ان کی تینوں لڑکیاں لیٹی بیٹھی ہیں۔ بڑی کوئی ناول پڑھ رہی ہے۔ منجھلی ناخونوں پر پالش لگا رہی ہے اور چھوٹی کسی کھیل میں لگی ہوئی ہے۔

"بیٹا ننگے پاؤں مت پھرا کر۔"

"بیٹا دھوپ میں مت کھیلا کر۔ سر میں درد ہونے لگے گا۔ رنگ کالا پڑ جائے گا۔"

"ذرا دیر سستا لے۔ کھیل کوئی بھاگا تھوڑی جا رہا ہے۔"

"گھڑے میں سے نہیں صراحی میں سے پی۔ اس کا پانی زیادہ ٹھنڈا ہے۔"

اور اگر شامتِ اعمال کہیں کھیل کو دچھوڑ کر اپنے گھر میں گھس جاتے تو ـــ

"جھاڑو پھرے تمہاری صورتوں پر۔ باہر لو چل رہی ہے۔ اور تم ہو کہ کدکڑے لگاتے پھر رہے ہو۔"

"ٹھہر آنے دو اپنے باپ کو۔ نہ کی ہو آج تیری شکایت تو کہنا۔"

"خبردار جو اب نکالا قدم گھر سے باہر۔ لیٹ جا پنکھے کے نیچے اور جو ہلا تو یاد رکھنا ٹانگیں رکھ دوں گی توڑ کے۔"

خالہ جانی کے چار اولادیں تھیں ـــ ایک لڑکا اور تین لڑکیاں۔ سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس کی شادی میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہو چکی تھی اور وہ کسی دور دراز مقام پر

ملازم تھا۔ اور ہر ماہ منی آرڈر سے کچھ روپیہ خالہ جانی کو بھیجا کرتا تھا مگر خالہ جانی کو اس سے کوئی خاص محبّت نہ تھی۔ وہ تو اپنی لڑکیوں پر جان چھڑکتی تھیں۔ اور جو کچھ مدد لڑکا کرتا تھا وہ سب کی سب نہیں تو زیادہ تر ان پر خرچ ہوا کرتی تھی۔ ان کے کپڑوں پر۔ ان کی کریم، پاؤڈر سرخی، تیل، پالش، سرمہ، چوٹی، کنگھی پر، سنا ہے کہ لڑکے کی پرورش انہوں نے کچھ یونہی سی کی تھی۔ نہ سلیقے کی تعلیم دلائی اور نہ اچھی تربیّت دی۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ ایک نوکری تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو اسے وطن سے دُور لے گئی اور اس دور دراز مقام پر اس نے اپنی پسند سے شادی کرلی۔ جب دلہن گھر آئی تو سنا ہے کہ خالہ جانی نے اتنی ناک بھوں چڑھائی کہ لڑکا دو دن بعد ہی اپنی دلہن کو لے کر اُس دور دراز مقام کے لئے روانہ ہو گیا جہاں وہ ملازم تھا۔ خالہ جانی کی ناک بھوں چڑھنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ لڑکے نے بغیر ان کی اجازت کے شادی کیوں کرلی بلکہ یہ کہ اُس نے ان کے لئے خوبصورت بہو کیوں تلاش نہیں کی۔ وہ شکل صورت کی معمولی تھی مگر بدصورت کسی طرف سے بھی نہیں تھی۔ طور طریقوں اور عادات و اطوار کی بہت اچھی تھی۔ ملنسار، خلیق، سیدھی سادی۔ مگر خالہ جانی کو اِن صفات کو لے کر کیا چاٹنا تھا۔ وہ تو چندے آفتاب چندے ماہتاب بہو چاہتی تھیں جو نہیں ملی۔

لیکن انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کو حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ وہ ہر سال گرمی کے موسم میں دو تین مہینوں کے لئے اپنی تینوں بیٹیوں کو لے کر بیٹے کے ساتھ رہنے جاتیں۔ ماموں کو وطن میں چھوڑ جاتیں اور وہ یہ دو تین مہینے اپنا کھانا آپ پکا کر گزارتے۔ جب خالہ جانی اس دُور دراز مقام سے واپس آتیں تو ان کی بیٹیوں کے پاس بہت سے نئے نئے کپڑے ہوتے۔ آرائش جمال کی نئی نئی چیزیں ہوتیں اور ان کی اپنی زبان پر یا تو اپنی بہو کی برائیاں ہوتیں یا سفر کے بڑے دلچسپ قصّے ہوتے۔

ایک قصّہ آپ بھی سُن لیجئے۔

"ارے نفیسہ (یہ میری والدہ کا نام ہے) تمہیں ایک بڑے مزے کی بات تو بتانا بھول

سی گئی!

وہ اپنے بیٹے کے پاس سے ابھی ابھی لوٹی تھیں اور حسبِ معمول امّی جان ان سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ خالہ جانی تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ امّی جان ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ خالہ جانی کی تینوں بیٹیاں پاس کے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور میں فرش پر گولیوں کی مشق کر رہا تھا۔

خالہ جانی نے پان کا ایک اور بیڑا منہ میں ٹھونستے ہوئے قصّہ جاری رکھا۔

"گاڑی جب کامٹی کے اسٹیشن پر رُکی تو ایک ٹی۔ ٹی ای آئی کے ڈبے میں گھس آیا۔ سب کے ٹکٹ چیک کر چکا تو ہماری طرف رجوع ہوا۔ اب تم دیکھو کہ رجوع تو ہوا تھا۔ ٹکٹ دیکھنے کے لئے مگر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ جیسے اسے سانپ سُونگھ گیا ہو۔"

اس مقام پر ان کی بڑی لڑکی آہستہ سے ہنسی اور خالہ جانی نے قصّے کی ڈُور ایک لمحے کے لئے چھوڑ دی۔ میں نے گولیوں کی مشق چھوڑ کر امّی جان کی طرف دیکھا۔ وہ ہمہ تن گوش تھیں خالہ جانی نے آگے جھک کر اگالدان میں پیک تھوکی اور پھر ایک نظر حاضرین پر ڈال کر بولیں۔

"میں نے پرس (میرے گھر میں اس وقت تک صرف بٹوے استعمال ہوتے تھے۔ اس لئے پرس کا لفظ میرے لئے نیا تھا) میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے تو وہ شرما گیا۔ کہنے لگا رہنے دیجئے۔ تکلیف نہ کیجئے اور پھر مجھ سے اجازت مانگ کر بھنّو (یہ ان کی بڑی لڑکی کا نام تھا) کے پاس بیٹھ گیا۔

"اگلے اسٹیشن پر اتر گیا، مگر ہر اسٹیشن پر آکر ڈبے کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور بھنّو کو دیکھتا ایک اسٹیشن پر اپنے کچھ ساتھیوں کو بھی لایا۔ اور وہ سب ڈبے کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے اور بھنّو کی طرف دیکھ دیکھ کر بوٹی فل بوٹی فل (یہ انگریزی لفظ بیوٹی فل کا خالہ جانی برانڈ چربہ تھا) کہنے لگے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ بھنّو بھی بہت ہنسی۔ اس کے بعد تو سارے راستے اس نے

ہمارے اتنے کام کیئے کہ مت پوچھو۔ کبھی پان لاکر دیتا۔ کبھی برف لا دیتا۔ کبھی پھل خرید لاتا اور کبھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بھنو جنہیں ہم لوگ اپیا کہتے تھے واقعی بڑی "بوٹی فل" تھیں۔ صاف رنگت، لمبے لمبے بال، جھکی ہوئی پلکیں، دراز قد، پتلے پتلے ہونٹ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک اور نازک بدن۔ کسی طرف سے بھی خالہ جانی کی بیٹی نہیں لگتی تھیں۔ کیونکہ خالہ جانی کا جسم بھرا بھرا تھا۔ ان کے ہونٹ موٹے تھے۔ ان کی رنگت سانولی تھی۔ ان کی پیشانی تنگ تھی۔ اور ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بات بات پر مٹکا کرتیں تھیں اور ان میں سے ایک عادتاً اکثر جھپک بھی جایا کرتی تھیں۔

ہم سب کو بھنو آپا بہت پسند تھیں۔ نانی، ابا جان، امی جان اور ہم سب بھائی بہن ان سے بہت پیار کرتے تھے اور وہ ہم سب کو بہت چاہتی تھیں۔ ان میں ایک قسم کا خلوص تھا جو دلوں کو چھو لیتا تھا۔ پاؤڈر کریم کے استعمال کے باوجود ایک طرح کی سادگی تھی جو چھپتی قسمت کی بات کہ یہ سادگی کچھ اس طرح بر دیئے کار آئی کہ اپیا کی زندگی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرح ٹیڑھی ہو کر رہ گئی

میری عمر اس وقت آٹھ نو برس کی تھی۔ ایک دن خالہ جانی کے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بڑے کمرے میں ایک مسہری بچھی ہوئی ہے۔ مسہری کے پاس ایک چمڑے کا سوٹ کیس رکھا ہوا ہے اور مسہری پر ایک نوجوان صاحب دراز ہیں۔ آنکھیں بند ہیں۔ شاید آرام کر میں دبے پاؤں کمرہ پار کر کے اندر چلا گیا۔ خالہ جانی اور ان کی تینوں لڑکیاں باورچی خانے میں مشغول تھیں۔ ناشتہ تیار کیا جا رہا تھا۔ پراٹھے پک رہے تھے۔ کباب تلے جا رہے تھے۔

میں بھی باورچی خانے میں گھس گیا اور اپیا سے پوچھنے لگا کہ باہر کے کمرے میں جو صاحب مسہری پر دراز ہیں وہ کون ہیں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اپیا نے جواب میں مجھے کھینچ کر اپنے بدن سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ "تمہیں نہیں معلوم"؟

ظاہر ہے کہ مجھے نہیں معلوم تھا. تبھی تو میں نے دریافت کیا تھا. مگر اپیا نے جس انداز سے مجھے اپنے بدن سے لگایا تھا اس میں سو سوالوں کا ایک ایسا جواب تھا جو میں اس کچی عمر میں بھی کچھ کچھ سمجھ ہی گیا.

مگر پھر بھی میں نے خالہ جانی سے اپنا سوال دہرایا. انہوں نے جواب میں "تمہیں نہیں معلوم!" بھی نہیں کہا. بس اپنی ایک آنکھ اشارتاً جھپکا دی اور بڑے معنی خیز انداز میں مسکرانے لگیں.

میں وہاں سے سیدھا اپنے گھر گیا اور جاکر امّی جان کو بتایا کہ خالہ جانی کے ہاں ایک مہمان آئے ہیں.

امّی جان نے پوچھا "کون مہمان؟"

میں نے جواب دیا "مجھے نہیں معلوم."

مگر چند دنوں میں مجھے بھی معلوم ہو گیا اور امّی جان کو بھی. ان کا نام طاہر تھا. وہ خالہ جانی کے دُور کے رشتے دار تھے. اور بقول خالہ جانی چھٹیاں گزارنے آئے تھے. کسی سرکاری دفتر میں ڈیڑھ دو سو روپے پر ملازم تھے. بڑے آدمی تھے کیونکہ اس زمانے کے ڈیڑھ دو سو روپے آج کل کے آٹھ نو سو روپیوں کے برابر تھے. بریلی میں رہتے تھے. سوٹ پہنتے تھے اور ٹائی لگاتے تھے.

جب تک وہ خالہ جانی کے ہاں ٹھہرے میرا معمول رہا کہ دن میں کم از کم ایک چکر ضرور ان کے گھر کا لگاتا. ہمارے محلے میں ان دنوں سوٹ پہننے اور ٹائی باندھنے والا ایک شخص بھی نہیں تھا. ہم سب کے سب شیروانی پوش تھے. اس لئے طاہر صاحب میں میرے لئے ایک ایسی کشش تھی جسے دبانا بڑا مشکل تھا. میں کبھی کبھی خالہ جانی کے ہاں گھنٹوں بیٹھا رہتا تاکہ طاہر صاحب کو دیکھ سکوں. دقت یہ پیش آتی کہ وہ چھت والے کمرے میں رہنے لگے تھے اور وہاں تک میرا گزر ناممکن تھا. خاص طور سے جب اپیا بھی ان کے پاس ہوتیں. ایسے وقتوں میں

خالہ جانی مجھے زینے کے پاس بھی نہ جانے دیتیں۔ یہ سمجھ لیجئے کہ ایک قسم کا پہرہ لگا رہتا۔ خالہ جانی اگر کسی کام میں مشغول ہوتیں تو ان کی لڑکیاں پہرے پر مامور ہوتیں اور میں مجبوراً نیچے صحن میں یا تو گولیاں کھیلتا یا ان کی سب سے چھوٹی لڑکی کے ساتھ جو عمر میں مجھ سے ایک آدھ سال چھوٹی تھی گٹے کھیلا کرتا۔

پھر اپیا چھت پر نمودار ہوتیں۔ چہرہ سرخ۔ آنکھیں جھکی ہوئی، دوپٹہ سر پر، آہستہ آہستہ زینہ اترتیں۔ میں ان کے پاس جاکر کھڑا ہو جاتا۔ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتیں۔ ایک آدھ بات کرتیں اور پھر جاکر خالہ جانی کے پاس بیٹھ جاتیں اور میں سب کی آنکھ بچاکر سیدھا چھت پر، کبھی طاہر صاحب مجھے کمرے میں بلا لیتے اور مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے۔ اور کبھی میں دُور سے انکے کپڑوں۔ ان کے چمکتے ہوئے جوتوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر واپس آجاتا۔

طاہر صاحب شاید ڈیڑھ دو مہینے خالہ جانی کے ہاں ٹھہرے اور پھر ایک دم غائب ہو گئے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ ان کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ اس لئے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی خالہ جانی کے گھر پر وہی بہار چھائی رہی جو ان کے قیام کے دوران میں چھائی ہوئی تھی۔ خالہ جانی اور ان کی بیٹیاں ان دِنوں بڑی خوش نظر آتیں۔ خاص طور سے اپیا جنہوں نے طاہر صاحب کے جانے کے بعد چھت والے کمرے میں اپنا ڈیرہ جما لیا تھا۔ ان دنوں ہرکٹم ترکٹم کا خالہ جانی کے گھر میں سکہ چلتا تھا۔ یہ ایک خاص قسم کی خفیہ بولی تھی۔ خالہ جانی اور انکی بیٹیوں کو اس بولی میں مہارت حاصل تھی اور وہ دوسروں کی موجودگی میں راز کی ساری گفتگو اسی بولی میں کیا کرتی تھیں۔ اس بولی کا اصول کچھ یوں سا تھا کہ الفاظ کے ہر دو حروف کے درمیان ر، ک اور ٹ کا اضافہ کر دیا جاتا تھا اور اس طرح ہم "ہرکٹم"، "تم" "ترکٹم" اور سے "سرکٹے" ہو جاتا۔ یہ اصول تو مجھے معلوم تھا مگر چونکہ مہارت نہ تھی اس لئے خالہ جانی جب اپنی بیٹیوں سے اس بولی میں گفتگو کرتیں تو میں کبھی ایک کا منہ دیکھتا اور کبھی دوسرے کا۔ امی جان کو بھی یہ بولی بخوبی آتی تھی۔ مگر وہ اس کا استعمال بہت ہی کم اور وہ بھی تفریحاً کرتی تھیں اور جب بھی خالہ جانی کو اس

بولی میں گفتگو کرتے سنیں تو بہت جز بز ہوتیں۔

طاہر صاحب کے جانے کے بعد بریلی سے ان کے فوٹو آنا شروع ہوئے۔ ایسے فوٹو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ایک دن خالہ جانی ہمارے ہاں آئیں تو ان کے ساتھ ان فوٹوؤں کا ایک پلندہ تھا۔ انہوں نے مسکرا مسکرا کر۔ ہنس ہنس کر۔ خوش ہو ہو کے یہ فوٹو امی جان کو دکھائے۔ میں بقول امی جان کے ان کے کولہے سے لگا بیٹھا تھا۔ میں نے بڑی دلچسپی سے ان تصویروں کو دیکھا۔ ان میں ایک نئی دنیا تھی جس نے فوراً مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ان تصویروں میں جو طاہر صاحب نظر آرہے تھے۔ وہ ان طاہر صاحب سے بالکل مختلف تھے جنہیں میں نے خالہ جانی کے ہاں اتنی مرتبہ دیکھا تھا۔ کسی فوٹو میں ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ کسی میں ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ کسی میں ان کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ان تصویروں کو دیکھ کر مجھے نونکی کا وہ تماشہ یاد آگیا جس میں ایک شخص سرخ دھبوں والے پھٹے کپڑوں میں بیڑیاں پہنے نگاڑے کی کڑم دھم۔ کڑم دھم پر سینے پہ ہاتھ مار مار کے گاتا تھا۔

لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں

لیلیٰ پیاری بسی مورے من میں

اور پھر ایک بار زور سے سینے پر ہاتھ مار کر چلاتا تھا۔

ہائے لیلیٰ!

جب خالہ جانی چلی گئیں تو امی جان اور نانی کے درمیان ایک کھسر پھسر کانفرنس ہوئی جس کی زیادہ تر گفتگو میرے کانوں تک نہ پہنچ سکی مگر جس کے چند ٹکڑوں کو سن کر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ان دونوں نے اس تصویری مجنونیت کو بہ نظر تحسین نہیں دیکھا۔ مگر مجھے یہ فوٹو اس قدر اچھے لگے تھے کہ میں بار بار خالہ جانی کے گھر جا کر آپا سے مانگ کر یہ تصویریں بڑے غور سے دیکھا کرتا۔ وہ مجھ سے پوچھتیں۔

"تمہیں اچھی لگتی ہیں یہ تصویریں؟"

میں جواب دیتا "ہاں بہت اچھی۔

وہ پوچھتیں" اور طاہر صاحب؟"

میں کہتا" وہ بھی۔"

یہ سنکر ان کا چمکتا ہوا چہرہ اور چمکنے لگتا اور وہ مجھے کھینچ کر اپنے بدن سے لگا لیتیں۔

تین چار ماہ بعد طاہر صاحب پھر نمودار ہوئے۔ پھر ان کا بستر چھت والے کمرے میں لگا دیا گیا۔ اور پھر اپیا کے ذمے ان کی دیکھ بھال۔ ان کی خاطر مدارت کردی گئی۔ وہ دن میں بیس بار زینہ چڑھتیں اور بیس بار اترتیں۔ کبھی ناشتہ لئے جارہی ہیں۔ کبھی کھانا، کبھی شربت، کبھی لسی، کبھی چائے۔ کبھی یہ کبھی وہ۔ مگر وہ اس دوڑ دھوپ۔ اس اترا چڑھی سے عاجز نہ آتیں بلکہ طاہر صاحب کی جتنی خدمت کرتیں اتنی ہی خوش ہوتیں۔ اور خوش ہونے کی بات بھی تھی کیونکہ طاہر صاحب اتنے اچھے جو تھے۔ اور اتنی اچھی اچھی باتیں جو کرتے تھے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے ایک دن سنا کہ وہ اپیا سے ان کے بالوں کی تعریف کر رہے تھے۔ کچھ اس طرح کہ میرا جی چاہنے لگا کہ میرے بھی ایسے ہی بال ہوتے تاکہ طاہر صاحب کے منہ سے ان کی تعریف سنتا۔

دو ڈھائی ماہ بعد وہ اچانک غائب ہو گئے۔ جس دن وہ روانہ ہوئے اس کے دوسرے دن میں خالہ جانی کے گھر گیا اور سیدھا چھت پر چلا گیا مگر وہاں تو کمرے میں تالا پڑا ہوا تھا۔ میں نیچے آکر اپیا کو تلاش کرنے لگا۔ وہ کوٹھری میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے طاہر صاحب کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگیں کہ وہ تو چلے گئے۔ میں نے دریافت کیا۔ کیوں؟ — تو بولیں۔ ان کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ اپیا اداس نظر آرہی تھیں۔ غیر شعوری طور پر میں طاہر صاحب کی تعریف کرنے لگا۔ مگر اپیا چپ رہیں اور انہوں نے مجھے کھینچ کر اپنے بدن سے نہیں لگایا۔ میں نے پوچھا کہ طاہر صاحب اب کب آئیں گے تو انہوں نے صرف اتنا کہا۔" کسے معلوم!"

دوسرے دن ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ یعنی خالہ جانی اور اپیا غائب ہو گئیں۔ خالہ جانی کی منجھلی لڑکی نے جس کا نام کنیزہ تھا مجھے یہ خبر سنائی کہ خالہ جانی اور اپیا اس دور دراز مقام پر چلی گئی ہیں جہاں

ان کا لڑکا کا سلسلۂ ملازمت مقیم تھا۔ لڑکے کی بیماری کا تار آیا تھا۔ اس لئے اچانک جانا پڑا۔ میں نے جاکر یہ خبر امّی جان اور نانی کو سنائی۔ ان دونوں میں فوراً میری موجودگی میں تبادلۂ خیال ہوا۔ امّی جان نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا۔ کہ خالہ جانی بغیر ان سے ملے چلی گئیں اور نانی نے اس بات پر کہ اوّل تو یہ فصل خالہ جانی کے سالانہ سفر کی نہیں تھی اور دوئم یہ کہ حسبِ معمول وہ اس دفعہ باقی دو لڑکیوں کو ہمراہ کیوں نہیں لے گئیں۔ مگر امّی جان نے ان کے اعتراضات کو رد کر دیا کیونکہ یہ غیر معمولی سفر تھا جس کا سبب لڑکے کی علالت تھی اور صرف اپنے اعتراض کو برقرار رکھا۔

خالہ جانی اور اپیا جس طرح اچانک غائب ہو گئیں تھیں۔ اسی طرح اچانک واپس آ گئیں۔ میں جلیبیاں لینے جا رہا تھا۔ خالہ جانی کے گھر کے سامنے سے گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تانگہ آکر دروازے کے سامنے رکا۔ ذرا سی دیر میں تانگے سے خالہ جانی اپنے ٹوپی والے برقعے میں نمودار ہوئیں۔ میں جاکر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر اپیا کا ہاتھ پکڑ کر جو ابھی تک پردہ بندھے تانگے میں بیٹھی تھیں۔ انہیں نیچے اتارا۔ میں نے اپیا کو سلام کیا تو انہوں نے جواب دینے کے لئے برقعے کی نقاب اٹھائی اور میں حیران رہ گیا۔ ان کی رنگت زرد تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ بڑی کمزور دکھائی دے رہی تھیں۔ خالہ جانی کا سہارا لے کر وہ گھر میں داخل ہوئیں۔

میں جلیبیاں بھول کر دوڑا دوڑا اپنے گھر پہنچا اور جاتے ہی امّی جان کو خالہ جانی اور اپیا کی آمد اور اپیا کی کمزوری کی خبر سنائی۔ امّی جان نے پُرمعنی نظروں سے نانی کی طرف دیکھا۔ نانی کی نظریں بھی پُرمعنی ہو گئیں گویا کہہ رہی ہوں — میں نہ کہتی تھی۔

یہ تو میں نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہتی تھیں اور کیا نہ کہتی تھیں مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ امّی جان اور نانی جو گھر سے بڑی مشکل سے نکلا کرتی تھیں اسی دن خالہ جانی کے گئیں۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ دونوں کو اپیا سے بڑی محبت تھی۔ خالہ جانی کی لڑکیوں میں انہیں صرف اپیا پسند تھیں میں ان کے ساتھ تھا۔ خالہ جانی نے انہیں اپنے لڑکے کی علالت کی ایک طویل داستان سنائی۔

اور یہ بھی بتایا کہ سفر کے دوران اپیا کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ اپیا کوٹھری میں فرد اوڑھے لیٹی تھیں۔ امی جان اور نانی انہیں دیکھنے اندر گئیں۔ اپیا نے انہیں سلام کیا مگر اٹھیں نہیں۔ جب امی جان اور نانی انہیں دعائیں دیتی باہر نکلیں تو پھر ان کی آنکھیں "میں نہ کہتی تھی" قسم کی گفتگو کر رہی تھیں۔

اپیا کی کمزوری آہستہ آہستہ دور ہو گئی اور وہ پھر چلنے پھرنے لگیں۔ چہرے کی زردی باقی رہ گئی تھی وہ بھی آہستہ آہستہ دُور ہو گئی۔ مگر اِن کا پُرانا رنگ لوٹ کر نہیں آیا۔ اور ان کے چہرے پر پرچھائیاں سی بنی رہنے لگیں۔

کچھ عرصے بعد ان کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا۔ امیدوار طاہر صاحب تھے۔ پتہ نہیں انہوں نے درخواست کی تھی، یا بات خالہ جانی نے چلائی تھی مگر یہ معلوم ہے کہ وہ میدان میں اکیلے تھے۔ خالہ جانی اپنے سارے اہم معاملات خود ہی طے کرنے کی عادی تھیں مگر تکلفاً امی جان اور نانی سے صلاح مشورہ کر لیا کرتی تھیں۔ سو اس معاملے میں ان کی رائے لی گئی۔ کئی مرتبہ کانفرنسیں ہوئیں اور ان دونوں نے ہر مرتبہ دبی زبان سے طاہر صاحب کی مخالفت کی۔ بنائے مخالفت کیا تھی یہ انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ مگر یہ صلاح مشورہ محض تکلف تھا۔ خالہ جانی فیصلہ کر چکی تھیں۔ طاہر صاحب میں انہیں سینکڑوں خوبیاں نظر آتی تھیں اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خوبرو اور خوش شکل تھے۔

ایک بار نانی نے کہہ دیا۔" شکل صورت کو لے کر کیا چاٹنا ہے۔ سیرت چاہیئے سیرت!"

اس پر خالہ جانی آگ بگولہ ہو گئیں اور انہوں نے طاہر صاحب کی ایسے حمایت کی جیسے وہ ان کے اپنے لڑکے تھے۔" کیا برائی ہے طاہر میں! کونسا عیب ہے اس میں! خدانخواستہ چال چلن خراب ہیں اس کے کیا! اور پھر شکل صورت کا ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہے"

موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے امی جان نے صلح جوئی کی۔" اماں کا مطلب یہ تھوڑی تھا کہ خدا نہ کرے اس میں کوئی عیب ہے، وہ تو یہ کہہ رہی تھیں کہ صورت سے زیادہ سیرت کا

خیال کرنا چاہیئے اور پھر طاہر میں تو بقول آپ کے سیرت بھی ہے اور صورت بھی۔"

خالہ جانی بولیں، "اور نہیں تو کیا!"

بات ختم ہو گئی مگر جب خالہ جانی جانے لگیں تو نانی پھر بول پڑیں۔ "لڑکا بھی تیار ہے؟"

خالہ جانی پھر آگ بگولہ ہو گئیں۔ "لڑکا نہیں تیار ہے تو کیا میں اس کی خوشامد کرنے گئی تھی۔" اور پھر رک کر، "مجال ہے اس کی جو تیار نہ ہو!"

خالہ جانی کے جانے کے بعد امی جان اور نانی میں تھوڑی دیر تک چخ پخ ہوئی۔ امی جان نے کہا۔ "تمہیں کیا پڑی تھی ان کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی۔"

"میں کیوں اڑانے لگی ٹانگ! میں تو اس کے بھلے کی کہہ رہی تھی۔ لڑکی کی زندگی خراب کرے گی، اور کیا!"

"کرنے دو خراب تم سے کیا مطلب!"

"مطلب و طلب خاک نہیں، منہ کی کھائے گی۔ اب وہ ہرگز نہیں کرے گا اس سے شادی۔ تم دیکھ لینا!"

مگر نانی کا فیصلہ غلط نکلا۔ اور خالہ جانی کا "مجال ہے اس کی جو تیار نہ ہو" صحیح۔ شادی ہوئی اور دھوم دھام سے ہوئی۔ میرا مطلب ہے سب رشتے دار جمع ہوئے۔ ڈھول بجے۔ کھانا ہوا۔ رسمیں ہوئیں اور پھر اپیا لال جوڑا پہن کر رخصت ہو گئیں۔

لیکن سال بھر بعد ایک بار جب وہ میکے لوٹ کر آئیں تو ان کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں۔ رنگت سیاہ پڑ گئی تھی۔ بالکل بجھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ خالہ جانی کا بیان تھا کہ کئی ماہ کی مسلسل علالت نے اپیا کا یہ حال کر دیا۔ مگر امی جان اور خاص طور سے نانی کی رائے کچھ اور ہی تھی۔ "طاہر اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا! کم بخت کہیں کی! بچی کی زندگی خراب کر کے رکھ دی!"

سچ ملنیئے اس دن مجھے اپنی والدہ اور نانی پر بہت غصہ آیا۔ آخر یہ لوگ ہمیشہ خالہ جانی

میں کیڑے کیوں نکالتے رہتے ہیں! اور پھر ان کے لئے ایسے الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں! اور خالہ جانی کے ہاں جو کچھ بھی ہو اس کا ایک نرالا سا مطلب کیوں نکال لیتے ہیں! اپیا بیمار رہیں، ان کی صحت خراب ہو گئی۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ آخر یہ لوگ خالہ جانی کے اس بیان کو قبول کیوں نہیں کرتے؟

اپیا کے بعد کنیز کا نمبر آیا۔ کنیز کی شکل صورت معمولی سی تھی۔ کچھ کچھ خالہ جان سے ملتی ہوئی۔ خاص طور سے موٹے ہونٹ، چھوٹی گردن، تنگ پیشانی اور ٹھگنا قد۔ مگر انہیں نہ تو بات بات پر اختلاج کا دورہ پڑتا نہ گرمی کی زیادتی سے غشی آتی تھی۔ نہ باورچی خانے کا کام کرنے سے ان کا دل گھبراتا تھا۔ اور نہ جھاڑو لگانے سے دم گھٹتا تھا۔ اسی لئے میں نے انہیں وہ دوائیں کھاتے کبھی نہیں دیکھا جو اپیا کھایا کرتی تھیں اور پھر خالہ جانی کی سب سے چھوٹی لڑکی نے جس کا نام زمرد تھا کھائیں۔ خمیرہ مروارید۔ آنولے کا مربع مع چاندی کے ورق کے۔ خمیرہ صندل، شربت گاؤزبان۔ حب یہ اور قرص فلاں۔

میں نے اکثر انہیں چولہے کے پاس دیکھا۔ ان کے ذمے گھر کا کام کاج تھا۔ کھانا پکانا جھاڑو دینا، برتن مانجھنا، بستر بچھانا یا پھر خالہ جانی کا بدن دبانا۔ خالہ جانی کے بدن میں نہ جانے کیوں اتنا درد ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے بھی مکیاں لگوایا کرتی تھیں۔ انہیں بھی اختلاج کی شکایت تھی لیکن اتنی نہیں جتنی اپیا کو شادی سے پہلے رہی اور پھر زمرد کو ہوئی۔

کنیز کا نمبر بڑی خاموشی سے آیا۔ ایک دن سنا کہ اس کی نسبت ہو گئی ہے۔ پھر سنا کہ شادی ہونے والی ہے۔ معلوم ہوا کہ پاس کے قصبے کے ایک اسکول میں ٹیچر ہیں۔ ان سے کنیز کی شادی ہو رہی ہے۔

شادی ہوئی مگر بغیر کسی دھوم دھڑکے کے۔ دولہا میاں ایک بڑی سی پگڑی باندھ کر آئے۔ پگڑی پر سہرے کی جگہ دو ایک ہار پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں کوئی رنگین رومال نہیں تھا۔ اس لئے نکاح کے وقت ان کا منہ صاف نظر آتا رہا اور جب ان سے آمنت باللہ والی

دعا پڑھوائی گئی تو میں نے دیکھا کہ ان کے سامنے کے دو دانت غائب ہیں اور ان کی مونچھ میں چند سپید بال موجود ہیں۔

جب کنیز کی شادی ہوئی تو میری عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ ان کی شادی کے بعد ہم لوگ نانی کے مکان میں منتقل ہو گئے جس کی پچھواڑے کی دیوار خالہ جانی کے گھر سے ملی ہوئی تھی۔ اس دیوار میں ایک کھڑکی تھی جس میں سے ہو کر ہم لوگ خالہ جانی کی چھت پر پہنچ جاتے تھے۔

نانی کے مکان میں منتقل ہونے کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لوگوں کا خالہ جانی کے ہاں آنا جانا بڑھ گیا۔ اب ہم لوگ ان کی چھت پر پتنگ اڑاتے اور ڈور لوٹتے تھے۔ ان کے گھر میں گولیاں کھیلتے اور کبھی کبھی ان کا کوئی کام کر دیتے۔ خالہ جانی کو کھٹائی اور مرچوں کا بہت شوق تھا۔ میں نے اکثر انہیں اور ان کی لڑکیوں کو امیا یا کچی املی کی چٹنی سے روٹی کھاتے دیکھا جس میں بہت ساری مرچیں پڑی ہوتیں اور جسے وہ چٹخارے لے لے کر کھاتیں اور کہتیں کہ قورمے اور پلاؤ میں وہ مزہ کہاں جو چٹنی اچار میں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہم لوگوں کو یہ تنبیہ بھی کر دیتیں کہ مردوں کو زیادہ کھٹائی اور مرچیں نہیں کھانا چاہیئے اور جب میں ان سے پوچھتا کہ کیوں تو وہ پہلے تو کوئی یونہی سا جواب دیتیں۔ مگر جب میں پیچھے پڑ جاتا تو بڑے پرمعنی انداز میں مسکرا کر کہتیں کہ اس سے مردانگی پر اثر پڑتا ہے اور ان کا جواب سنکر ان کی لڑکیاں ہنسنے لگتیں۔

مجھے خالہ جانی کی یہ بات بہت پسند تھی یہی کہ وہ مجھے ایسی باتیں بتا دیا کرتی تھیں جو میرے اپنے گھر میں مجھے کوئی بھی نہیں بتاتا تھا۔ اس سے ایک قسم کی آسودگی حاصل ہوتی تھی۔ نہ جانے کیوں، مثلاً کھٹائی والی بات۔ امی جان اور نانی بھی ہم لوگوں کو زیادہ کھٹائی اور مرچیں کھانے سے منع کیا کرتی تھیں۔ مگر ہماری کیوں کا جواب انہوں نے کبھی نہیں دیا۔ یہ نہیں کہ اس کچی عمر میں خالہ جانی کے جواب کا مطلب میری سمجھ میں آجاتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ خالہ جانی نے جیسے مجھے کوئی راز بتا دیا۔ مجھے اپنا ہمراز بنا لیا۔ مجھے اپنا ہمراز بنانے کے قابل

سمجھا اور اس احساس سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ ایک قسم کا بڑا پن محسوس ہوتا تھا۔

تو وہ یا تو ہم لوگوں سے پکے آم اور کچی املیاں منگواتیں جو ہم لوگ قبرستان میں لگے۔ املی کے پیڑ سے یا پورن کی بغیا سے توڑ کر لادیتے۔ یا پھر وہ ہمیں بدبودار صابن کے ڈبے دے کر کہتیں کہ خلاں دکان سے جا کر یہ صابن لے آؤ مگر چھپا کر لانا۔ مجھے تعجب ہوتا کہ خالہ جانی یا ان کی لڑکیاں اتنا بدبودار صابن کیوں استعمال کرتی ہیں۔ جو بدبو ان ڈبوں سے آیا کرتی تھی وہی کبھی کبھی میں نے ان کے غسل خانے کی نالی میں سے آتے بھی سونگھی تھی۔ اس سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا کہ وہ یہ تاکید کرتی ہیں کہ صابن چھپا کر لاؤں۔ کیونکہ میرا خیال یہ تھا کہ یہ بھی اسی قسم کا صابن ہے جو نانی گرمی دانے مارنے کے لئے استعمال کرتی ہیں اور جس سے نیم کی بُو آتی ہے۔ حالانکہ نانی نیم کا صابن منگواتے وقت اس قسم کی کوئی بھی تاکید نہیں کرتی تھیں۔

مگر یہ سب باتیں اس زمانے کی ہیں جب ہم نانی کے مکان میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ اور میری عمر کم تھی۔ جب میں تیرہ چودہ برس کا تھا تب بھی خالہ جانی کبھی کبھی کچی املیوں اور امیوں کی فرمائش کر دیتی تھیں مگر صابن نہیں منگواتی تھیں۔ ان دنوں اپیا اور کنیز اپنی اپنی سسرالوں میں تھیں اور زمرد جو مجھ سے سال چھ مہینے چھوٹی تھی ایک دم بڑی ہو گئی تھی۔

زمرد جوان کیا ہوئی قیامت آگئی۔ شاعری والی قیامت نہیں بلکہ سچ مچ کی قیامت۔ اس کی جوانی نے خالہ جانی اور امّی جان کے تعلقات کو ایسا تانا کہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچے۔ اس تناؤ میں شاعری والی قیامت کو بھی کچھ نہ کچھ دخل تو تھا ہی۔ زمرد چھوٹی سی تھی تو اس کی ناک بہا کرتی تھی۔ جسے کبھی کبھی وہ زبان کو لپلپا کر چکھ لیا کرتی تھی۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو وہ ہر وقت ایک انگلی نتھنوں میں ڈال کر کینچوے نکالا کرتی تھی اور پھر ان کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر انہیں انگلیوں سے مسلا کرتی تھی۔ اس کی شکل صورت معمولی سی تھی، نہ بُری نہ اچھی مگر جوان ہوئی تو انقلاب آگیا۔ اس کے چہرے میں ایک عجیب قسم کی کشش اور اس کی جلد میں ایک نرالی چمک آگئی۔ اس کی پلکیں بڑے پیارے انداز سے جھکی جھکی رہنے لگیں۔ دوپٹہ اس کے سر پہ ایک خاص زاویے سے ٹکا رہنے لگا۔ اور وہ ہر آنے

جانے والے کی خدمت میں اپنے مخصوص انداز میں تسلیمات اور آداب عرض کرنے لگی۔ سر کو ذرا سا جھکا کر، گردن میں ذرا سا خم پیدا کر کے۔ ایک ہاتھ کو چھوٹی سی کشتی کی شکل دے کر اسے چہرے کے سامنے لا کر اور دوسرے سے دوپٹے کو سینے پر سنبھال کر۔

میری امی جان بڑی حسن پرست ہیں۔ جس خوبصورت لڑکی کو دیکھتیں تڑپ کر رہ جاتیں کہ اسے اپنی بہو بنا لیں۔ ہاتھ ملا رہتی تھیں کہ ان کا کوئی لڑکا اتنا بڑا نہیں تھا جس کی شادی وہ اپیا سے کر دیتیں۔ اب زمرد جو اس زور شور سے جوان ہوئی تو وہ پھسل گئیں۔ میرے بڑے بھائی صاحب اس زمانے میں کالج میں تھے۔ ابھی ان کی شادی کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مگر امی جان کو لڑکی بھا گئی تھی۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ کوئی اور بات نہ کر بیٹھے فوراً اپنی بہن خالہ جانی سے کہہ دیا کہ زمرد کی شادی تو میں قیصو (یہ میرے بڑے بھائی کے نام قیصر کی بگڑی کی صورت تھی) سے کروں گی۔
امی جان سمجھی ہوں گی کہ خالہ جانی ان کی بات سن کر خوشی کے مارے پھولی نہ سمائیں گی کیونکہ گھر اچھا تھا، لڑکا پڑھا لکھا تھا، دیکھا بھالا تھا۔ مگر خالہ جانی کا ردعمل الٹا ہی ہوا۔ انہوں نے اگالدان اٹھا کر اس میں پیک انڈیل کر دوپٹے کے کونے سے ہونٹوں کے گوشوں کو پونچھ کر ٹھہر ٹھہر کر کہا کہ زمرد کی شادی کے معاملے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتیں کیونکہ بھنو (اپیا) نے اس کے لئے ایک لڑکا تلاش کر رکھا ہے جو ان دنوں لندن میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔
بس پھر کیا تھا قیامت آ گئی۔ وہاں تو وہ کیا کہتیں۔ اپنا سا منہ لے کر چلی آئیں مگر اپنے گھر آ کر امی جان جو برسی ہیں تو تھمنے کا نام نہ لیتی تھیں۔
"لندن میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے! ایسے ہی تو سرخاب کے پر لگے ہیں۔ اُن کی لونڈیا میں کہ لندن میں ڈاکٹری پڑھنے والے لونڈے اس سے شادی کریں گے۔ جاہل بیٹی اور لندن کا ڈاکٹر داماد! سمجھتی ہیں کہ ہر ایک کی آنکھ میں دھول جھونک سکتی ہیں۔ پہلے اپنی اوقات کو دیکھیں پھر کریں بڑی بات۔"
لگے ہاتھوں انہوں نے زمرد کی شان میں بھی ایک لمبا سا قصیدہ پڑھ ڈالا۔ اُس کی ایک ایک

بات۔ اُس کے ایک ایک نقش۔ اُس کی چال، اُس کی گفتگو کے انداز۔ اُس کے اُٹھنے بیٹھنے اور اُس کے کاڑھنے پرونے میں انہوں نے وہ وہ عیب نکالے ہیں کہ اگر کوئی غیر شخص سنتا تو یہ سمجھتا کہ زمرد جیسی بدصورت۔ اُس جیسی جاہل اور اُس جیسی بدسلیقہ اور پھوہڑ لڑکی نہ پیدا ہوئی ہے اور نہ پیدا ہوگی۔ اور یہ قصیدہ اُسی زمرد کی شان میں پڑھا گیا تھا جسے آدھ گھنٹہ قبل تک وہ اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔

خالہ جانی کا انکار اِک سانحہ سا ہو گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے امّی جان اور نانی خالہ جانی کا ذکر کرتیں۔ اُن کے عیوب گنائے جاتے۔ اُن کے بچپن کے قصے دہرائے جاتے۔ اُن کی جوانی کے واقعات بیان کئے جاتے۔ اُن کی تانک جھانک، اُن کی دیدہ دلیری، اُن کے دیدوں کا پانی مر جانے پر تبصرے ہوتے اور نانی آخری شعر یا مقطع یوں پڑھتیں "اللہ بخشے تمہارے باپ کو اتنی جلدی نہ کرتے تو نہ معلوم کیا گل کھلاتی"۔ اُن کا خطاب امّی جان سے ہوتا۔ اپیا کی "قسمت" کا تذکرہ بھی ہوتا۔ خالہ جانی کی بہو کا نام بھی آتا۔ اُن کے لڑکے کا بھی ذکر ہوتا۔ اور ماموں کے "حال" پر ترس بھی کھایا جاتا۔

اِس ساری فوں فاں کا نتیجہ یہ نکلا کہ امّی جان اور نانی نے خالہ جانی کے ہاں جانا بند کر دیا۔ خالہ جانی ایک آدھ مرتبہ آئیں مگر امّی جان اور نانی کے تیور پہچان گئیں اور پھر انہوں نے بھی ہمارے گھر کا رخ نہیں کیا۔ مگر اس کشیدگی کا ہم لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہم لوگ اُسی طرح خالہ جانی کے ہاں آتے جاتے رہے اور جب قیصو بھائی تعلیم ختم کر کے لوٹے تو وہ بھی بدستور خالہ جانی کے گھر جانے لگے۔

قیصو بھائی شام کو ٹہلنے جایا کرتے تھے اور لوٹتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے خالہ جانی کے ہاں ٹھہر جاتے۔ ان دنوں اپیا بھی آئی ہوئی تھیں۔ گھڑی دو گھڑی ان سے اور خالہ جانی سے ہلکی پھلکی گفتگو کر کے اپنے گھر آ جاتے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ گھڑی دو گھڑی کا پروگرام گھنٹے دو گھنٹے میں تبدیل ہو گیا۔ پھر ایک دن پتہ چلا کہ انہوں نے زمرد کو انگریزی پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ زمرد نے بغدادی

قاعدہ، قرآنِ پاک اور بہشتی زیور پڑھا تھا۔ قیصو بھائی نے انگریزی پڑھانے کی پیش کش کی تو خالہ جانی اور اپیا نے اسے فوراً قبول کر لیا اور قیصو بھائی روز شام کو زمرد کو سی۔ اے۔ ٹی کیٹ معنی بلی اور آر۔ اے۔ ٹی ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا پڑھانے لگے۔ پہلے آدھ گھنٹہ۔ پھر پون گھنٹہ۔ پھر ایک گھنٹہ اور ہوتے ہوتے ڈیڑھ دو گھنٹے روز تعلیم دی اور لی جانے لگی۔

امی جان کو جب اس مشغلے کا پتہ چلا تو انہوں نے کہا تو کچھ نہیں کیونکہ ہمارے گھر جوان لڑکوں کو بات بات پر ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا مگر میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ انہیں قیصو بھائی کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ سبب اس کا شاید یہ تھا کہ خالہ جانی ان کی توہین کر چکی تھیں۔

نہ معلوم یہ درس و تدریس کا سلسلہ کب تک جاری رہتا اگر ایک دن میرے ہاتھ زمرد کی مشق کی کاپی نہ لگ جاتی۔ بات یہ ہوئی کہ میں نے ان دنوں نئی نئی سگریٹ نوشی شروع کی تھی۔ قیصو بھائی بھی سگریٹ پیتے تھے مگر گھر کے بزرگوں سے چھُپ کر۔ مجھے ان کا یہ راز معلوم تھا کیونکہ انہوں نے خود مجھے بتاکید کی تھی کہ میں ہرگز ہرگز گھر میں کسی سے ان کی سگریٹ نوشی کا تذکرہ نہ کردوں۔ مگر انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ میں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی ہے۔ قیصو بھائی ان دنوں چھت والے کمرے میں رہتے تھے۔ یہ کمرہ کچھ اسی قسم کا تھا جیسا کہ خالہ جانی کا چھت والا کمرہ تھا۔ دونوں چھتوں کے درمیان ایک دیوار حائل تھی جس میں ایک کھڑکی لگی ہوئی تھی جس میں سے گزر کر خالہ جانی کے گھر سے ہمارے گھر اور ہمارے گھر سے خالہ جانی کے گھر آنا جانا ہوا کرتا تھا۔

میں بات سگریٹ کی کر رہا تھا۔ چونکہ میں چوری چھپے یہ فعل کیا کرتا تھا اس لئے اچھی سگرٹیں پینے سے قاصر تھا۔ کیونکہ ہمارے چھوٹے سے قصبے میں صرف دو دکانیں ایسی تھیں جہاں اچھی سگرٹیں ملا کرتی تھیں۔ ان دونوں دکانوں سے ہمارے ہاں سامان آیا کرتا تھا اس لئے خطرہ تھا کہ اگر وہاں سے سگرٹیں خریدوں گا تو گھر والوں کو پتہ چل جائے گا۔ لہٰذا پان بیڑی کی دکانوں سے پاسنگ شو اور قینچی مارکہ سگرٹیں خریدنا پڑتی تھیں۔ لیکن جب سے قیصو بھائی کالج سے لوٹے تھے یہ مسئلہ کچھ کچھ حل ہو گیا تھا۔ وہ "بلیک اینڈ وہائٹ" پیا کرتے تھے اور میں ان کی دراز میں رکھے ہوئے ڈبے میں

سے ہر روز دو تین سگریٹ میں چرا لیا کرتا تھا۔

ایک دن میں نے دراز کھولی تو ڈبہ غائب تھا۔ شاید ختم ہو گیا تھا یا شاید قیصو بھائی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مگر میں سمجھا کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہو گا۔ اس لئے میں نے ساری دراز کو کھنگال ڈالا۔ ڈبہ تو کیا خاک ملتا۔ ہاں زمرد کی کاپی ہاتھ لگ گئی پہلے ہی صفحے پر قیصو بھائی لکھا تھا۔ "آئی لویو۔" (I LOVE YOU) اور اس کے نیچے زمرد نے کوئی دس مرتبہ اس عبارت کی نقل کی تھی۔

میں یہ کاپی لے کر سیدھا امی جان کے پاس آ گیا۔ پہلے صفحے پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر امی جان کا رنگ سرخ ہو گیا۔ لیکن قیصو بھائی کی شان میں کچھ کہنے کے بجائے وہ مجھے ڈانٹنے لگیں — "تو کیوں ہر ایک کی چیزیں ٹٹولتا پھرتا ہے؟ تو کیوں گھستا ہے اس کے کمرے میں۔ تو نے کیوں لی اس کی دراز کی تلاشی؟"

میں دُم دبائے قیصو بھائی کے کمرے میں واپس گیا اور زمرد کی کاپی وہیں رکھ دی جہاں سے نکالی تھی مگر میرے منہ کو خون لگ چکا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز موقع پا کر قیصو بھائی کی دو تین سگریٹیں پار کر دیتا اور ساتھ ساتھ زمرد کی کاپی پر ایک نظر ڈال لیتا۔

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ اندر کے ایک صفحے پر زمرد نے لکھ رکھا ہے "کل آپ نے مجھے پیار کیوں کیا؟ کوئی دیکھ لیتا تو —"

میں پھر بھاگتا ہوا امی جان کے پاس پہنچا اور ڈرتے ڈرتے انہیں بتایا کہ آج میں نے زمرد کی کاپی میں ایک ایسی بات پڑھی کہ ......

"کہ کیا؟"

"مجھے شرم آتی ہے بتاتے!" حالانکہ شرم ورم خاک نہیں آ رہی تھی۔

"کہاں ہے کاپی؟"

"قیصو بھائی کے کمرے میں۔ ان کی دراز میں۔"

امّی جان کچھ کاڑھ رہی تھیں۔ وہ کڑھائی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور چلیں زینے کی طرف۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ کمرے میں پہنچ کر انہوں نے دراز کھولی۔ کاپی نکالی اور مجھ سے پوچھا "کہاں ہے"؟

میں نے آگے بڑھ کر ورق الٹے اور زمرد کی لکھی ہوئی عبارت ان کی نظروں کے سامنے لاکر رفو چکر ہوگیا۔

پتہ نہیں عبارت پڑھ کر امّی جان کا کیا حال ہوا۔ مگر اسی رات کمرے میں امّی جان، ابّا جان، نانی اور قیصو بھائی کے درمیان ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ میں صحن میں لیٹا ہوا تھا۔ بڑی دیر تک آوازیں آتی رہیں۔ مگر سمجھ میں خاک نہیں آیا۔

دوسرے دن امّی جان چھت والی کھڑکی میں سے گزر کر خالہ جانی کے ہاں گئیں۔ میں اس وقت اسکول میں تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ معاملہ بہت سنگین ہو گیا تھا۔ قیصو بھائی نے رات کی کانفرنس میں کھلم کھلا اظہارِ عشق کر دیا تھا اور امّی جان اور نانی کے سمجھانے کے باوجود اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے تھے۔ امّی جان کو اپنی عزّت پیاری تھی۔ اور قیصو بھائی کو زمرد، معاملہ ابّا جان نے بیٹے کے حق میں طے کیا اور فیصلہ ہوا کہ جھوٹی عزّت کو بالائے طاق رکھ کر امّی جان دوسرے دن خالہ جانی کے ہاں جائیں اور دیکھیں کہ خالہ جانی کا لندن میں ڈاکٹری پڑھنے والا داماد ابھی تک سدِ راہ بنا ہوا ہے کہ نہیں۔

ڈاکٹر سدِ راہ تو بنا ہوا تھا مگر امّی جان خالہ جانی کی بہن تھیں اور وہ بھی اکلوتی۔ ان پر اور ان کے بیٹے پر سے سو ڈاکٹر اور ہزار کلکٹر قربان۔

تو پھر پہلی مرتبہ جب امّی جان نے دامن پھیلایا تھا تو خالہ جانی نے انکار کیوں کر دیا تھا؟

امّی جان اور نانی کے درمیان گفتگو اس مرحلے پر پہنچ چکی تھی جب میں اسکول سے لوٹا۔ سوال نانی نے کیا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھیں۔ "اس وقت کون سے کیڑے پڑ گئے تھے اپنے قیصو میں"!

امّی جان جو نانی کو رپورٹ پیش کر رہی تھیں بولیں ــــ "فرمانے لگیں کہ اس طرح بات پکی

کر لینا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اپن تین کا زمانہ تھوڑی ہے کہ جہاں باوا اماں نے ہنکال دیا دیں چلے گئے۔ آجکل تو لڑکے لڑکی کی مرضی ضروری ہوتی ہے اور خالی مرضی ہی نہیں۔ کورٹ شپ بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کو کچھ سمجھ لیں۔ دیکھ بھال لیں۔"

نانی نے پوچھا "یہ موئی کورشپ کیا بلا ہوتی ہے؟"

امّی جان بولیں "کورشپ نہیں۔ کورٹ شپ۔ لڑکے لڑکی کا آپس میں ملنا۔"

"جھاڑو پھرے اُس کی صورت پر فرنگیوں کے طور طریقے بتانے چلی ہے۔ ایک کا کورشپ کر کے دیکھ چکی ہے۔ اب دوسری کی زندگی خراب کرنے پر تلی ہے۔"

"اور نہیں تو کیا۔ میرے جی میں تو آئی کہ لے جاکر دکھا دوں انہیں ان کی لونڈیا کی کاپی تاکہ پتہ چل جائے کہ کیسی کورٹ شپ کر رہی ہیں ان کی صاحبزادی۔"

جملہ ختم کرتے ہوئے امّی جان نے پاندان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ان کی نظر مجھ پر پڑی اور گویا انہیں پہلی مرتبہ میری موجودگی کا احساس ہوا۔ "تو ضرور گھس جایا کر ہر جگہ لڑکیوں کی طرح۔"

بات پکی ہو چکی تھی مگر تاریخ وغیرہ کا سوال ابھی تک نہیں اٹھایا گیا تھا کیونکہ قیصو بھائی کو ملازمت تلاش کرنا تھی۔ گھر والے اس کے خلاف تھے کہ قبل اس کے کہ لڑکا اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اس کی شادی کر دی جائے۔ اس لئے قیصو بھائی نے اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنا شروع کئے۔ اور اس سلسلے میں دو تین ماہ بعد ان کا ناگپور سے بلاوا آ گیا۔ جہاں ہمارے چچا جان ڈپٹی کلکٹری کے ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ لڑائی کا زمانہ تھا۔ نوکریوں کی افراط تھی۔ انہوں نے قیصو بھائی کو بذریعہ خط یقین دلایا کہ وہ ناگپور آجائیں تو ان کے لئے بہت جلد ایک اچھی سی ملازمت کا بندوبست کر دیا جائے گا۔

اس خط کے بعد جو خط چچا جان نے بھیجا اس نے ہمارے گھر میں تہلکہ مچا دیا۔ دونوں خطوط کے درمیان کوئی چھ سات مہینے کا فاصلہ تھا۔ اس عرصے میں قیصو بھائی کو ناگپور میں ملازمت

مل چکی تھی اور وہ چچا جان کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ ان کے خطوط آتے رہتے تھے۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔ خیر خیریت۔ موسم کا حال اور سب چھوٹوں بڑوں کی طرف سے سب چھوٹوں بڑوں کو سلام اور دعا لکھی ہوتی تھی۔ اچانک ان کے خط بہت ہی مختصر ہونے لگے اور ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئے۔ کوئی مہینے بھر وہ بالکل خاموش رہے اور جو نا گپور سے خط آیا تو وہ چچا جان کا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنے بھائی جان یعنی ہمارے والد صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کی لڑکی نزہت کو اپنی بہو بنا کر احسان کریں۔ دبے لفظوں میں انہوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ لڑکے کو لڑکی پسند ہے۔

اس خط کی آمد پر کچھ دیر تو ہمارے گھر پر بڑی حیرت کا عالم طاری رہا لیکن جلد ہی مسرت نے حیرت کی جگہ لے لی۔ امی جان اور نانی بہت مسرور تھیں کہ قیصو نے زمرد کے بارے میں اپنا ارادہ بدل دیا۔ حالانکہ انہوں نے نزہت کو کئی سال سے نہیں دیکھا تھا مگر انہیں یقین تھا کہ نزہت زمرد سے لاکھ درجے بہتر ہو گی۔ دونوں نے اپنی یادداشت پر زور ڈال کر نزہت کے باپ، ماں، نانا، نانی اور دیگر رشتے داروں کے ناک نقشوں اور رنگ روغن کو یاد کیا اور نتیجہ نکالا کہ جوان ہو کر نزہت ضرور بڑی پیاری سی لڑکی نکلی ہو گی اور اس میں تو کسی کو شبہ ہی نہیں تھا کہ وہ بڑی سگھڑ، بڑی سلیقہ شعار ہو گی کیونکہ گھرانہ سگھڑ اور سلیقہ شعار تھا۔ ابا جان بھی خوش تھے کہ ان کی بھتیجی ان کی بہو بنے گی۔ مگر انہیں قیصو بھائی کی یہ تلون مزاجی بالکل پسند نہ تھی کہ آج اس لڑکی کو دیکھا تو اس پر جان چھڑکنے لگے اور کل اس لڑکی کو دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گئے "آثار اچھے نہیں۔" انہوں نے امی جان سے کہا۔

گھر بھر میں ایک میں تھا جسے قیصو بھائی کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ میں زمرد کے حق میں تھا۔ شاید سبب اس کا یہ تھا کہ اسے بچپن سے جانتا تھا اور نزہت کو میں نے صرف دو تین بار وہ بھی بہت عرصہ ہوا دیکھا تھا مگر میں نے اپنے غصے کا اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ کوئی بھی اس کا نوٹس نہیں لے گا حالانکہ میں میٹرک پاس کر چکا تھا اور کالج جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

ابا جان نے اس بار ڈھیل دینا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً امی جان کو لے کر ناگپور روانہ ہو گئے
جہاں منگنی کی رسم ادا کر کے وہ خوش خوش گھر واپس آ گئے۔ امی جان واپس آنے کے بعد کئی دن تک
زمرد کے گن گاتی رہیں ۔۔ کالج جاتی ہے۔ بیڈمنٹن کھیلتی ہے۔ گھر کا کام کاج بھی جانتی ہے۔
چندے آفتاب ہے۔ چندے مہتاب ہے، حالانکہ ناک ذرا چھوٹی ہے۔ تندرست ہے۔ اسے اختلاج
کا دورہ نہیں پڑتا۔ گانا بھی آتا ہے۔ بڑی ہنس مکھ ہے۔ وغیرہم۔

پھر ایک دن وہ خالہ جانی کے ہاں گئیں۔ اور انہیں مطلع کر آئیں کہ "بہن لڑکے نے ارادہ
بدل دیا۔ میں کیا کروں۔ یہ آج کل کے لڑکے....."

خالہ جانی نے جواب دیا "میں تو تمہارے کہنے سے راضی ہو گئی تھی۔ ورنہ زمرد کے لئے لڑکوں
کی کیا کمی۔ وہ لڑکا جو لندن میں ڈاکٹری پڑھ....."

اس کے بعد میں کالج چلا گیا۔ اور چھ سال تک وطن سے دور رہا۔ کبھی کبھار جب گھر آتا تو
خالہ جانی اور زمرد سے ملاقات ہوتی۔ مگر ایسے مواقع بہت کم میسّر آتے۔ کیونکہ چھٹیاں زیادہ تر سیر و
تفریح میں گزر جاتیں۔ علاوہ ازیں مجھے کالج میں داخل ہوئے ابھی بمشکل دو سال گزرے تھے کہ ماموں
کا انتقال ہو گیا۔ اور خالہ جانی زمرد سمیت اپنے لڑکے کے پاس چلی گئیں۔ ماموں کے انتقال کے بعد
میں خالہ جانی سے صرف ایک بار مل سکا۔ بڑے دن کی چھٹیوں میں گھر آیا۔ ماموں کے انتقال کو شاید
ڈیڑھ دو مہینے ہوئے تھے۔ خالہ جانی سفر کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ میں پرسے کے لئے ان کے گھر گیا۔
بڑے پیار سے پیش آئیں۔ مجھے سینے سے لگایا۔ پھر اچھی طرح سے میرا جائزہ لیا اور میری تعریفیں کرنے
لگیں: "کیا خوبصورت جوان نکلا ہے۔ میرا لال۔ تو شیروانی مت پہنا کر۔ تجھ پر سوٹ بڑا بھلا لگتا
ہے" وغیرہ وغیرہ۔ میں بہت دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔
وہ اس دور دراز مقام پر جانے کے خیال سے خوش تھیں جہاں ان کا لڑکا مقیم تھا۔ وطن کی آب و ہوا
انہیں راس نہیں آتی تھی۔ اختلاج کی شکایت بڑھ گئی تھی۔ ٹانگوں میں مسلسل درد رہنے لگا تھا۔ زمرد
کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی تھی۔ میں نے پاس بیٹھی ہوئی زمرد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد

سیاہ دھبے ضرور نظر آرہے تھے مگر ویسے وہ اچھی بھلی لگ رہی تھی۔

خالہ جانی باتیں کرتی رہیں اور میں سوچتا رہا کہ ماموں مرحوم کا ذکر آئے تو میں دو چار جملے افسوس اور غم کے کہوں، مگر اس گھنٹے دو گھنٹے کی گفتگو میں ان کا نام ایک بار بھی خالہ جانی کے منہ سے نہیں نکلا۔ اس لئے مجھے وہ دو چار جملے کہے بغیر ان کے ہاں سے واپس آنا پڑا۔ چلتے وقت میں نے ایک نظر مکان پر ڈالی اور مجھے پتہ چل گیا کہ کیوں خالہ جانی نے ماموں کا ذکر نہیں کیا۔ جب وہ حیات تھے تب بھی ان کی موجودگی کا احساس اس گھر میں بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ اور اب جب وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کی غیر موجودگی کا احساس کرنا اور بھی مشکل تھا۔

اس ملاقات کے بعد میں خالہ جانی سے تب ملا جب تعلیم سے فراغت حاصل کر کے بیکار دنوں اور بیکار راتوں کے چکر میں گھرا ہوا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ میں امتحان کے نتیجے کے انتظار میں دن بھر گھر میں پڑا رہتا تھا۔ اب اس چھوٹے سے قصبے میں دل نہیں لگتا تھا۔ پرانی دوستیاں یا تو ختم ہو چکی تھیں یا دم توڑ رہی تھیں۔ نئی دوستیاں، کالج کی دوستیاں دُور دُور بکھر گئی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وقت کیسے گزارا جائے۔

اس اکتاہٹ کے عالم میں خالہ جانی اور زمرد کا اچانک ورود بڑا خوش آئند تھا۔ انہیں دیکھتے ہی دل کو ایک طرح کا سہارا مل گیا۔ اور یہ یقین ہو گیا کہ چلو کچھ دن اچھے گزر جائیں گے۔ خالہ جانی میں ہم لوگوں کے لئے بچپن سے ایک قسم کی کشش تھی۔ وہ جس طرح کی باتیں کرتی تھیں اس قسم کی باتیں ہمارے گھر میں نہیں ہوتی تھیں۔ اس لئے اپنا گھر ان کے گھر کے مقابلے میں مجھے ہمیشہ پھیکا پھیکا سا لگا کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان سے گفتگو کرتے وقت ابا جان بھی کچھ کھل سے جایا کرتے تھے۔ ان دونوں میں خوب ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ شاید اس لئے کہ رشتہ اس کا تقاضا کرتا تھا۔

ان کے اچانک آنے سے گھر کا ماحول بدل گیا۔ کم از کم میرے لئے ان کی باتیں جنہیں نانی "لچھے دار" کہا کرتی تھیں۔ ان کے قصے، ان کے چٹکلے، ان کے لطیفے دلچسپی کا سامان بن گئے اور

وہ اکتاہٹ جو گلا دبوچے رہتی تھی چاروں شانے چت گر پڑی۔

خالہ جانی کی آمد کا مقصد کچھ کچھ کاروباری تھا۔ یعنی وہ اپنے مکان کی دیکھ بھال کرنے اور اس کی مرمت کرانے آئی تھیں مگر خالہ جانی کا کہنا تھا کہ اتنا عرصہ ہو گیا تھا انہیں اپنی بہن سے ملے اس لیئے چلے آئیں حالانکہ جیسا کہ واقعات نے ثابت کیا دونوں قول غلط تھے۔

چونکہ ان کے مکان میں اب کرایہ دار رہتا تھا اس لئے خالہ جانی اور زمرد نے ہمارے گھر قیام کیا۔ انہی دنوں مجھے سخت بخار آیا۔ کئی دن بستر پر پڑا رہا۔ کوئی ہفتے بھر پنڈا پھنکتا رہا۔ گھر کے سب لوگوں نے تیمارداری کی۔ مگر امّی جان کے علاوہ اس تیمارداری میں خالہ جانی پیش پیش رہیں۔ کبھی سر دبائیں، کبھی جب بخار تیز ہو جاتا تو تولیئے سے ہتھیلیاں اور تلوے سہلائیں۔ رات کو بارہ بارہ ایک ایک بجے تک میری پٹی سے لگی بیٹھی رہتیں۔

ایک دن شام کو جب بخار ٹوٹ چکا تو میرا پلنگ صحن میں بچھا دیا گیا۔ اس وقت صرف خالہ جانی میرے پاس تھیں۔ وہ میرا سر دبا رہی تھیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ ان کا ایک ہاتھ نہ جانے کیسے میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس ہاتھ کی ایک انگلی میں وہ سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئی تھیں۔ میں یونہی بلا وجہ اس انگوٹھی کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور پھر اس بے چینی کے عالم میں جو شدید بیماری اکثر انسانوں میں پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے خالہ جانی سے کہہ دیا کہ وہ مجھے بھی ایک ایسی ہی انگوٹھی بنوا دیں۔ عجیب بیہودہ سی فرمائش تھی۔ کیونکہ اوّل تو مجھے انگوٹھی پہننے کا شوق نہیں تھا۔ اور اگر شوق چرایا بھی تھا تو گھر والوں سے کہنا چاہیئے تھا نہ کہ خالہ جانی سے جن کے لئے سونے کی انگوٹھی خریدنا ایک بڑے مالی مسئلے سے ہرگز کم نہ تھا۔ مگر انہوں نے خوش ہو کر فوراً مجھے یقین دلایا کہ جونہی میں بالکل اچھا ہو جاؤں گا وہ ایک عدد سونے کی انگوٹھی میری نذر کریں گی۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ میرا مطلب ہے جہاں تک میرا تعلق تھا بات آئی گئی ہو گئی۔ دو چار دن بعد میں بالکل اچھا ہو گیا اور چلنے پھرنے لگا اور یہ بالکل بھول گیا کہ میں نے خالہ جانی سے سونے کی انگوٹھی کی فرمائش کی تھی۔

لیکن وہ نہیں بھولی تھیں۔ ایک رات جب میں ٹہل کر گھر لوٹا تو کہنے لگیں، "بیٹا میرا ایک کام کر دو گے۔"

میں نے کہا، "ضرور فرمائیے۔"

بولیں "تمہاری اپیا کا خط آیا ہے وہ یہاں آنا چاہتی ہیں۔ تمہارے دولہا بھائی کو چھٹی نہیں مل سکتی۔ تم جا کر انہیں لے آؤ گے؟"

میں نے کہا، "کیوں نہیں۔"

میں دوسرے دن بریلی روانہ ہو گیا اور چوتھے روز مع اپیا کے گھر واپس آ گیا۔ گھر آیا تو معلوم ہوا کہ کنیز جو پاس کے قصبے میں رہتی تھیں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ خالہ جانی ان سب لوگوں کو کیوں جمع کر رہی ہیں مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ خالہ جانی اتنے سال بعد وطن آئی ہیں اس لئے اپنی لڑکیوں سے ملے بغیر کیسے واپس جا سکتی ہیں۔

مگر میرا خیال غلط نکلا، بہت غلط نکلا، اور اس غلطی کا پتہ جب چلا جب ایک رات امی جان نے مجھے الگ بلا کر بے انتہا سنجیدگی سے پوچھا، "میاں بیٹے (وہ مجھے اس عجیب و غریب مرکب نام سے پکارا کرتی تھیں)، کیا تمہارا خیال زمرد سے شادی کرنے کا ہے؟"

انگریزی میں ایک محاورہ ہے جس کے معنی کچھ کچھ یہ ہیں کہ آپ کا سر چھت سے جا ٹکرایا۔ پتہ نہیں اس میں کتنا ابلاغ ہے مگر سچ مانئے اگر اس کمرے کی چھت نیچی ہوتی جس میں امی جان نے مجھ سے یہ انتہائی سنجیدہ سوال کیا تھا تو میرا سر یقیناً اس سے ٹکرا جاتا۔ جوانی میں انسان کیا کچھ نہیں سوچتا اور کیسے کیسے بڑے اور گندے خواب نہیں دیکھتا مگر یقین جانئے میرے ان خیالات اور ان خوابوں پر زمرد کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امی جان کے سوال کا مجھ پر کیا اثر ہوا ہو گا۔

مگر میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بناوٹی لاپرواہی سے جواب دیا "نہیں تو۔"

"مگر تمہاری خالہ جانی تو فرماتی ہیں کہ تم نے خود ان سے کہا ہے۔"

"میں نے؟"

"ہاں. تم نے. انہوں نے تو مجھے یہی بتایا۔"

"یہ تو سراسر جھوٹ ہے. میں نے ان سے کبھی ایسی کوئی بات کی ہی نہیں۔"

"مگر وہ تو کہہ رہی تھیں کہ تم نے ان سے کہا تھا کہ وہ تمہیں ایک سونے کی انگوٹھی بنوادیں۔"

میں سکتے میں آگیا۔

"میں نے کہا تو تھا. مگر....."

"مگر کیا خاک. انہوں نے اس کا مطلب یہ نکالا کہ تم زمرد سے بیاہ کرنا چاہتے ہو اور منگنی کی انگوٹھی مانگ رہے ہو۔"

"مگر میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔"

"یونہی کہہ دیا تھا! ـــ نہیں اگر انگوٹھی پہننے کا ایسا ہی شوق تھا تو مجھ سے کہا ہوتا۔"

"مگر امی جان میں کہہ جو رہا ہوں کہ میں نے یونہی کہہ دیا تھا. اور پھر یہ انگوٹھی مانگ کر شادی کی بات کرنا کس ملک کا رواج ہے؟"

"میں کیا جانوں. پر تمہاری خالہ جانی فرماتی ہیں کہ انگریزوں میں یہی رواج ہے۔"

میرے جی میں آیا کہ دوڑا ہوا خالہ جانی کے پاس جاؤں اور جاتے ہی ان سے لڑ پڑوں مگر پیر ہلے تک نہیں۔

"جہاں تک مجھے پتہ ہے انگریزوں میں ایسا کوئی رواج نہیں۔"

"نہ ہو گا. مگر وہ تو یہی مطلب نکال کر بیٹھ گئی ہیں. انہوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ لڑکا تیار ہے اور اسی واسطے انہوں نے اپنی لڑکیوں کو بھی بلا کر اکٹھا کر لیا ہے۔"

"میں تو بالکل تیار نہیں اور نہ کبھی ہوں گا۔"

امی جان کا چہرہ قدرے کھلا۔

"تو میں جا کر کہہ دوں ان سے۔"

"فوراً"۔

دوسرے دن سارے گھر پر سناٹا سا چھایا رہا۔ تیسرے دن خالہ جانی اور ان کی لڑکیوں کے بستر بند بندھنے لگے اور چوتھے دن چار دن مسافر اپنی اپنی منزلوں کو روانہ ہو گئے۔ پانچویں دن "خالہ" نے جو بھیں تو ملازمہ مگر جن کا رتبہ گھر والوں جیسا تھا بتایا کہ خالہ جانی روانہ ہونے سے قبل انہیں یہ اطلاع دے گئیں کہ "میاں بیٹے سے زمرد کی شادی اس لئے طے نہ ہو سکی کہ میاں بیٹے کی صحت اچھی نہیں رہتی"۔

اس انگوٹھی والے واقعے کے چند ماہ بعد پاکستان بن گیا۔ نانی مرحوم ہو چکی تھیں۔ قیصو بھائی ناگپور میں تھے اور ابا جان کو وطن عزیز تھا۔ باقی سب لوگ لاہور چلے گئے۔

ایک دن نسبت روڈ پر چلا جا رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دکان میں جس پہ بدیسی شرابوں کے بہت سے چھوٹے بڑے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے خالہ جانی کے لڑکے جن کا نام سردار تھا بیٹھے ہوئے ہیں مگر خط کے مضمون اور لفافے میں بہت فرق نکلا۔ یہ دکان کبھی شراب کی رہی ہو گی لیکن جب سے سردار بھائی نے اس پر قبضہ جمایا تھا۔ شراب کی بوتلوں کی جگہ کریم، صابن، پاؤڈر تیل۔ سینٹ، موزہ، بنیان، انڈر ویر، تولیہ تاش وغیرہ نے لے لی تھی۔

سردار بھائی کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ وہ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا کہ پردیس میں جو اب اپنا وطن بن گیا تھا۔ کوئی بھی دوست یا عزیز مل جاتا تو بڑی خوشی ہوتی۔ تھوڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھا۔ ان کی ہجرت کی داستان سُنی، اپنی سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ خالہ جانی مع زمرد کے ملتان میں اپیا کے پاس ہیں ــ یعنی اپیا اور طاہر صاحب بھی انتقال کر کے پاکستان تشریف لے آئے!۔ انہوں نے بتایا کہ تقسیم سے کچھ روز قبل خالہ جانی اور زمرد اپیا کے پاس بریلی گئی تھیں۔

پاکستان بنا تو سردار بھائی کو مع اپنی اہلیہ، لڑکا اور لڑکی کے سر پہ پیر رکھ کر بھاگنا پڑا۔ ان کی روانگی کے چند ہفتوں بعد طاہر صاحب اور اپیا کو بھی بھاگنا پڑا۔ اور ان کے ساتھ خالہ جانی اور زمرد بھی وارد پاکستان ہوئیں جس کا جدھر منہ اٹھا نکل گیا۔ سردار بھائی نے لاہور میں ڈیرہ جمایا

اور اپیا اور طاہر صاحب نے ملتان میں۔

ایک دن سردار بھائی اور ان کی بیوی ہمارے ہاں آئے تو انہوں نے خبر سنائی کہ خالہ جانی اور زمرد ملتان سے لاہور آگئی ہیں اور ان کے ساتھ مقیم ہیں۔ سردار بھائی تو تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے مگر ان کی بیوی جنہیں ہم لوگ بھابی کہتے تھے دن پھر ہمارے ہاں رہیں۔ نئے ملک کی باتیں ہوتی رہیں اور پرانے قصے دہرائے جاتے رہے۔ یہ ناممکن تھا کہ پرانے قصے دہرائے جائیں اور خالہ جانی کا ذکر نہ آئے۔ خاص طور سے جبکہ دہرانے والی امی جان اور بھابی ہوں۔ آخر الذکر نے بتایا کہ تقسیم سے پہلے خالہ جانی سردار بھائی سے ناراض ہو کر اپیا کے پاس چلی گئی تھیں کیونکہ انہیں شکایت تھی کہ ان کا لڑکا ان کا اور زمرد کا خیال نہیں رکھتا۔ انہیں یہ بھی شکایت تھی کہ ان کی بہو ان کی عزت نہیں کرتی اور یہ بھی کہ وہ زمرد کی ضروریات کی چیزیں مثلاً کریم۔ پاوڈر منگا کر نہیں دیتی۔

"اب آپ ہی بتائیں امی جان" ـــ بھابی بھی ہماری والدہ کو امی جان ہی کہتی تھیں۔ "کون مانے گا ان کی بات۔ جس بیٹے نے ساری عمر انہیں خرچ بھیجا۔ اس سے یہ شکایت کہ خیال نہیں رکھتا ـــ اور میں نے تو ان سے کبھی جھلا کر بھی بات نہیں کی۔ جتنا میں نے ان کا خیال رکھا اتنا تو ان کے لڑکے نے بھی نہ رکھا ہوگا۔ رہ گئی زمرد کی بات تو آپ ہی بتائیں کہ اتنی روکڑ ہم کہاں سے لائیں کہ اس کے تیل پھلیل کا خرچ برداشت کریں۔ ہر مہینے ریشمی جوڑا بنوا کر دیں۔ جتنی چادر اتنے پیر پھیلانا چاہیئے۔ اور پھر ہمارے سامنے اپنی اولاد بھی تو ہے۔ کتنی دفعہ کہا کہ لڑکی کے فرض سے فارغ ہو جایئے مگر انہیں تو کوئی لڑکا پسند ہی نہیں آتا۔ خوبصورت ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ اچھی آمدنی ہو۔ لڑکی کی عمر نکلی جا رہی ہے اور ان کی شرطیں ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔"

امی جان کی طرف سے سوال کیا گیا کہ ملتان سے کیوں آگئیں۔

جواب دینے سے پہلے بھابی نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور پھر رازدارانہ انداز میں یوں گویا ہوئیں۔

"جھوٹ سچ خدا بہتر جانتا ہے۔ منے کے ابا بھی اس معاملے میں مجھ سے ڈھکی چھپی رکھتے

ہیں مگر ایک دن ماں بیٹے میں کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ میرے کان میں بھی کچھ بھنک پڑ گئی۔"

اس مرحلے پر پہنچ کر ان کی آواز بہت مدھم ہو گئی۔" مجھے تو ایسا معلوم پڑتا ہے کہ طاہر صاحب کی وجہ سے بھاگیں ملتان سے۔ اس آدمی کی عادتیں اچھی نہیں اور جوان سالی کا ساتھ۔ خیریت اس میں جانی ہو گی کہ بھاگ لیں وہاں سے۔ ویسے جھوٹ سچ خدا بہتر جانتا ہے۔"

جب تک خالہ جانی سردار بھائی کے پاس رہیں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ کبھی ہم لوگ ان کے ہاں جاتے اور کبھی وہ ہمارے گھر آتیں۔ موٹی زیادہ ہو گئی تھیں۔ بینائی کمزور ہو چلی تھی۔ جوڑوں میں درد رہنے لگا تھا۔ بجز اس کے وہی خالہ جانی تھیں کہ جو ہمیشہ رہیں۔ وہی لطیفے بازی وہی ایک آنکھ جھپکانا۔ وہی مزے دار باتیں۔ وہی پان سے بھرا ہوا کلا۔ وہی گھومتی پھرتی آنکھیں ــــ زمرد میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ پہلے سے کچھ دبلی ہو گئی تھی اور آنکھوں کے گرد چھوٹے چھوٹے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے جن سے بقول خالہ جانی اس کے چہرے کی کشش میں اضافہ ہو گیا تھا۔

ایک دن میں دفتر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرا کمرہ مجھ سے چھین لیا گیا ہے اور میرا سامان ایک دوسرے کمرے میں لگا دیا گیا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس تبدیلی کی وجہ دریافت کروں امی جان نے مجھے الگ لے جا کر بتایا کہ خالہ جانی مع زمرد کے ہمارے ہاں اٹھ آئی ہیں اور چونکہ میرا کمرہ الگ تھلگ ہے یعنی دوسری منزل پر ہے اس لئے انہیں یہ کمرہ الاٹ کر دیا گیا ہے۔

میں نے اس انتقال کا سبب دریافت کیا تو امی جان نے بتایا کہ خالہ جانی کی سردار بھائی سے لڑائی ہو گئی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بقول خالہ جانی ان کی بہو نے ان کے لڑکے سے ان کا جھگڑا کروا دیا اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کے گھر میں ایک لمحہ ٹھہرنا بھی اپنی بے عزتی تصور کیا۔ اس لئے وہ اور زمرد اپنا بستر بوریا باندھ کر ہمارے ہاں براجمان ہو گئیں۔ ہوا یہ تھا کہ سردار بھائی نے جو عرصے سے زمرد کے رشتے کی تلاش میں تھے ایک لڑکا ڈھونڈ نکالا

تھا۔ جوان کی اور ان کی بیوی کی نظر میں ہر لحاظ سے زمرد کے لئے موزوں تھا مگر خالہ جانی کی نظر میں وہ کسی لحاظ سے بھی زمرد کا مستحق نہیں تھا۔ سردار بھائی کا خیال تھا کہ لڑکا چونکہ رنڈوا ہے اس لئے زمرد کا بہت خیال کرے گا اور ان کی بیوی کی رائے تھی کہ وہ ویسے بھی اس عمر میں زمرد کو کوئی بہت اچھا رشتہ ملنے سے رہا۔ اس لئے رشتہ منظور کر لینا چاہیئے۔ رنڈوا تھا تو کیا ہوا۔ اکیلا تھا۔ اور سب سے خوبی کی بات یہ تھی کہ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ آمدنی بھی معقول تھی۔ سرکاری دفتر میں ملازم تھا مگر خالہ جانی اس بات پر ہرگز تیار نہ تھیں کہ ان کی لڑکی کی شادی ایک ایسے "مردوے سے ہو جو اپنی پہلی بیوی کو کھا چکا ہے۔" مزید برآں اس کی آمدنی بھی کم تھی۔ یعنی صرف دو سو روپے ماہوار۔ ان کی زمرد کی شادی کلرک سے ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔" ایسی چاند سی لڑکی اور ایسا لڑکا" اور نہ جانے انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکے کی ایک آنکھ میں کچھ عیب ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اسے" کانے خان" کا خطاب عطا کر دیا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ خوب چخ چخ ہوئی۔ سردار بھائی اور ان کی بیوی نے اُن تمام لڑکوں کی فہرست گنا کر رکھ دی جو زمرد کے لئے تلاش کئے گئے تھے اور جنہیں خالہ جانی نے رَد کر دیا تھا۔ اور خالہ جانی نے وہ تمام عیوب گنا ڈالے جن کی بناء پر وہ لڑکے رد کئے گئے تھے۔ معاملہ جب یہاں تک پہنچ گیا تو لامحالہ اور باتوں کا ذکر بھی آیا۔" جوان لڑکی" " پرایا دھن"۔ "کون عمر بھر گھر بٹھا کر کھلاتا ہے"۔ قسم کے دلائل پیش کئے گئے مگر خالہ جانی اپنی "جیتی مکھی نہیں نگلی جاتی" اور "جب تک میں زندہ ہوں زمرد کو جہنم میں نہیں دھکیلا جا سکتا" پر اڑی رہیں۔ اسباب و دلائل کی جگہ تلخی نے لے لی جو یہاں تک بڑھی کہ خالہ جانی نے گھر چھوڑنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ ان کے بیٹے اور بہو نے طنزیہ پوچھا۔" جاؤ گی کہاں"؟ ان کا خیال تھا کہ اپیا اور طاہر صاحب کے ہاں جانے سے رہیں کیوں کہ وہاں سے ایک دفعہ بھاگ چکی ہیں اور اپیا اور طاہر صاحب کے علاوہ ان کا اس ملک میں اور کون ہے؟ مگر خالہ جانی کو معلوم تھا کہ ان کا اس ملک میں اور کون ہے۔

"جاؤں گی کہاں۔ اپنی بہن کے ہاں۔ اور کہاں۔ تم لوگ سمجھتے ہو گے کہ پردیس میں میرا کوئی

ٹھکانہ نہیں مگر ابھی میری بہن زندہ ہے۔ سگی نہ سہی مگر تم جیسے سگوں سے اچھی ہے۔"

اور گھر چھوڑتے وقت انہوں نے اعلان کر دیا کہ "مرتے مر جاؤں گی مگر اس چوکھٹ پر اب ہرگز قدم نہ رکھوں گی۔"

اس اعلان کا جواب بقول خالہ جانی ان کی بہو نے یہ دیا کہ "دیکھیں کب تک ٹکڑے تڑواتی ہیں آپ کی بہن۔ ایک نہ ایک دن یہیں لوٹ کر آنا پڑے گا۔"

سردار بھائی اور ان کی بیوی کا خیال ہو گا کہ اس وقت خالہ جانی غصّے میں ہیں۔ جب غصّہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ واپس آجائیں گی۔ ہم لوگوں کا بھی شروع شروع میں یہی خیال تھا کہ ماں بیٹے کی لڑائی ہے کچھ وقت گزرا نہیں کہ ماں بیٹے پھر ایک ہو جائیں گے اور ایک دن خالہ جانی مع زمرد کے سردار بھائی کے ہاں واپس چلی جائیں گی۔ اگر یہ وہم نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ امّی جان خالہ جانی اور زمرد کی ذمہ داری لینے سے کتراتیں۔

مگر یہ خیال غلط نکلا۔ کیونکہ جب چھ ماہ بعد میرا تہران تبادلہ ہوا تو خالہ جانی اور زمرد دونوں ہمارے گھر تھیں اور امّی کو یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ ہرگز سردار بھائی کے پاس واپس نہیں جائیں گی۔ کیونکہ اس دوران میں سردار بھائی کئی بار انہیں واپس لے جانے کی کوشش کر چکے تھے مگر بے سود۔ اگر زمرد بیچ میں نہ ہوتی تو وہ ہرگز خالہ جانی کو اپنے ہاں رکھنے سے نہ گھبراتیں لیکن زمرد کی وجہ سے انہیں خالہ جانی کی موجودگی بھی بوجھ لگتی تھی حالانکہ منہ سے کچھ نہ کہتی تھیں کیونکہ بہن کا معاملہ تھا۔ سگی نہ سہی رشتے کی سہی۔ مگر تھیں تو بہن۔

میں تہران میں لگ بھگ سال بھر رہا۔ اس عرصے میں امّی جان کے خطوں سے خالہ جانی اور زمرد کے حالات کا پتہ چلتا رہا۔ خالہ جانی کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ کوئی خاص بیماری نہ تھی مگر ان پر کئی چھوٹی چھوٹی بیماریوں نے ایک ساتھ حملہ کر دیا تھا۔ نزلہ، زکام، کھانسی، بخار جوڑوں کا درد، معدے کی خرابی وغیرہ وغیرہ۔ ان کی بینائی بھی کم ہو گئی تھی۔ چلنے پھرنے سے معذور تو نہیں ہوئی تھیں مگر بہت کم چلتی پھرتی تھیں اور وہ بھی سہارا لے کر۔

زمرد کے بارے میں صرف اتنا پتہ چلا کہ بہت کمزور ہو گئی ہے اور اس کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی۔

سال بھر بعد میں چھٹی لے کر گھر پہنچا تو میرے ساتھ ایک ایرانی بیوی بھی تھی۔ گھر کے سب لوگ اس کے فوٹو دیکھ چکے تھے۔ مگر تصویروں سے کہاں تسلی ہوتی ہے۔ ہر ایک شخص چلتی پھرتی ہنستی بولتی چلتی جاگتی بہو یا بھابی کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔ خالہ جانی بھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ گھر کے سب لوگوں نے میری پسند کو سراہا۔ خالہ جانی نے بھی۔ حالانکہ انہیں میری بیوی میں ایک سقم ضرور نظر آیا وہ یہ کہ اس میں نمک نہیں تھا جو "اپنی طرف کی لڑکیوں میں ہوتا ہے۔"

خالہ جانی ابھی تک اس کمرے میں مقیم تھیں جس میں کبھی میں رہتا تھا۔ مگر زمرد نیچے آ گئی تھی۔ اس کمرے میں جس میں میری چھوٹی بہن تمینہ رہتی تھی۔ خالہ جانی کی بیماری کی وجہ سے اسے ان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے سے تکلیف ہوتی تھی۔ اس لئے وہ نیچے آ گئی تھی۔

خالہ جانی کی تیمارداری زیادہ تر امی جان کرتی تھیں اور کبھی کبھار گھر کے لڑکے اور لڑکیاں اور زمرد بھی اس نیک کام میں شامل ہو کر ثواب حاصل کر لیا کرتے تھے۔ خالہ جانی امی جان کے سلوک سے بہت خوش تھیں اور زمرد سے انہیں کوئی شکایت نہیں تھی۔ کیونکہ یہ اس کے "کھیلنے کودنے کے دن" تھے۔ وہ کیسے اپنا سارا وقت ایک بیمار کی تیمارداری میں صرف کر دیتی۔

خالہ جانی اب چلنے پھرنے سے قاصر ہو چکی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے روز انہیں بخار ہو جاتا تھا۔ کھانا ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتا تھا۔ ہر وقت کراہتی رہتی تھیں اور امی جان کو دعائیں دیا کرتی تھیں۔

مگر اس زمرد میں جس کا ذکر امی جان اپنے خطوط میں کرتی تھیں اور اس زمرد میں جسے میں نے تہران سے واپس آ کر دیکھا بہت فرق تھا۔ وہ تو کمزور تھی نہ اس کی رنگت زرد تھی اور نہ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک روز یونہی امی جان سے ذکر بھی کیا کہ زمرد کی صحت تو اب بہت اچھی ہے اور اب تو وہ بہت خوش اور چونچال نظر

آتی ہے۔ مگر امّی جان نے صرف "ہاں" کہہ کر مجھے ٹال دیا۔

زمرد کی ایک سہیلی گھر میں تھی اور ایک پڑوس میں۔ گھر کی سہیلی ثمینہ تھی اور پڑوس کی سہیلی کا نام نکہت تھا۔ کام کاج سے فارغ ہوتی تو ثمینہ کے کمرے میں گھس جاتی یا نکہت کے ہاں چلی جاتی۔ مگر جب سے میں آیا تھا وہ فرصت کا وقت زیادہ تر نکہت کے گھر گزارا کرتی تھی۔ نکہت کو اور اس کے گھر والوں کو ہم لوگ اچھی طرح سے جانتے تھے۔ گھر پر والدین کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ اس کا ایک بھائی تھا جو بسلسلہ ملازمت کراچی میں مقیم تھا۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ شریف لوگ تھے۔ باعزت لوگ تھے۔ اس لئے ان سے میل جول بہت بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ ان کا نوکر ہمارے کام کر دیتا اور ہمارے نوکر ان کا کام۔

جاڑوں کی گھپ اندھیری رات تھی۔ سارا گھر سو چکا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی نہ معلوم کتنی دیر سے ہو رہی تھی۔ میں نے لیمپ آن کیا اور دروازہ کھولنے سے پہلے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بج رہا تھا۔

امّی جان اور ثمینہ دروازے پر کھڑی تھیں اور ان کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمودار تھے۔ امّی جان اور ثمینہ اندر آئیں تو میری بیوی بھی جاگ گئی۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے۔"

امّی جان نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر بولیں "ذرا میرے ساتھ آؤ میاں بیٹے۔"

میں ان کے ساتھ ہو لیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے کہا۔ "زمرد ابھی تک نہیں لوٹی!"

"نہیں لوٹی! کہاں سے نہیں لوٹی؟"

"نکہت کے ہاں سے۔"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ دیر ہو گئی ہو گی۔"

"آج تک اتنی دیر کبھی نہیں ہوئی۔"

"شاید وہیں سو گئی ہوگی۔"

"یہ بھی آج تک اُس نے کبھی نہیں کیا۔"

"تو چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

امّی جان نے کہا "ثمینہ کو ساتھ لے جاؤ۔"

نکہت کا گھر ہمارے گھر سے چند قدم پر تھا۔ راستے میں ثمینہ نے بتایا کہ وہ پڑھتے پڑھتے بغیر لیمپ بجھائے سو گئی تھی۔ ذرا دیر ہوئی اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ زمرد کا بستر خالی ہے وہ یہ سمجھ کر کہ زمرد نکہت کے گھر یا کسی اور کمرے میں ہو گی، لیمپ بجھا کر پھر سونے ہی والی تھی کہ اسے خیال آیا کہ وقت تو دیکھ لے۔ گھڑی دیکھی تو پتہ چلا کہ ایک بجنے والا ہے پھر تو اسے تشویش ہوئی اور اس نے جا کر امّی جان کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔

دس بارہ منٹ دستک دی تب کہیں نکہت کے گھر کا دروازہ کھُلا اور وہ بھی اس کے نوکر نے نہیں بلکہ اس کے والد نے کھولا۔

جب ہم لوگ ڈرائینگ روم میں پہنچ گئے تو میں نے دریافت کیا کہ زمرد تو نہیں ہے ان کے ہاں۔

کہنے لگے نہیں مگر پھر بولے کہ نکہت سے پوچھ لیا جائے۔ شاید اس کے کمرے میں ہو یا شاید اُسے پتا ہو۔

نکہت کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی باہر آئی۔ مجھے اور ثمینہ کو اتنی رات گئے اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی۔

اس کے والد نے پوچھا کہ زمرد تو نہیں اس کے ساتھ۔

وہ بولی "نہیں تو۔"

پھر انھوں نے پوچھا کہ اسے زمرد کی کچھ خیر خبر معلوم ہے۔

وہ پھر بولی "نہیں تو۔ مگر کیوں؟ - کیا ہوا؟"

ہم لوگ کوئی الٹا سیدھا جواب دے کر واپس آ گئے۔ امّی جان انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں بتایا کہ نہ تو زمرد نکہت کے ہاں ہے اور نہ اُن لوگوں کو اس بارے میں کچھ پتا ہے۔

امّی جان سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔ "میرا تو اسی وقت ماتھا ٹھنکا تھا۔"

گھر میں اچانک دن ہو گیا۔ سب لوگ جاگ پڑے۔ قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ پریشانی کے اظہار ہونے لگے۔ اتنے میں باہر کے دروازے پر دستک ہوئی ہم لوگ سب دروازے کی طرف دوڑے مگر نکہت، اس کی والدہ اور اس کے والد کو دیکھ کر سخت مایوس ہوئے۔ وہ پوچھنے آئے تھے کہ آخر بات کیا ہے۔ زمرد کو کیا ہو گیا۔ یہ تو انہیں معلوم ہی ہو چکا تھا کہ زمرد گھر پر نہیں ہے۔ اس لئے ان سے کیا چھپاتے۔ پوری بات یعنی جو کچھ پتہ تھا انہیں بتانا پڑا۔

تب نکہت کے والد مجھے۔ نکہت کی والدہ امّی جان کو، اور نکہت ثمینہ کو الگ الگ کمروں میں لے گئے۔ پانچ سات منٹ بعد ہم سب پھر اس کمرے میں جمع ہو گئے جہاں سے لے جائے گئے تھے۔ نکہت کے والد نے مجھے۔ نکہت کی والدہ نے امّی جان کو اور نکہت نے ثمینہ کو بتایا تھا کہ ــــ

ان کے خیال میں زمرد ان کے نوکر نادر کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

میرے اور ثمینہ کے واپس آنے کے بعد انہوں نے نادر کی کوٹھری کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ نہ صرف نادر غائب ہے بلکہ اس کا ٹرنک اور بستر ابھی غائب ہے۔ ان کے شبہ کو تقویت نکہت کے اس بیان سے پہنچی کہ اس نے اکثر زمرد کو نادر کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ ثمینہ نے نکہت کو بتایا کہ اسے بھی زمرد کا ایک نوکر کے ساتھ اس طرح بے تکلفی سے بات کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ امّی جان نے نکہت کی والدہ سے کہا کہ مجھے تو وہ نادر کا بچہ شروع ہی سے آوارہ سا لگتا تھا اور میں نے نکہت کے والد سے کچھ بھی نہیں کہا۔ مجھے شروع ہی سے شبہ نہیں یقین تھا۔ اتنے میں باورچی خانے کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی۔ جب سے خالہ جانی کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ گھنٹی کا بٹن ان کے کمرے میں لگوا دیا گیا تھا تاکہ وقت بے وقت

اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت پڑے یا کسی کو بلانا ہو تو وہ گھنٹی بجا دیں. تھوڑی دیر بعد خانساماں دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ "بڑی بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔"

امی جان نے پوچھا "کسے؟"

کہنے لگا: "آپ کو۔"

امی جان نے میری طرف دیکھا اور میں نے ان کی طرف.

میں نے کہا: "آپ ہی جائیے۔"

کہنے لگیں: "تم جاؤ۔"

میں "اچھا" کہہ کر چلنے لگا تو بولیں: "ٹھہرو۔ کیا کہو گے؟"

میں نے کہا "کچھ بھی نہیں۔"

کہنے لگیں: "کب تک چھپاؤ گے۔"

میں بغیر جواب دیئے باہر نکل گیا.

خالہ جانی لیٹی ہوئی کراہ رہی تھیں. میرے قدموں کی آواز سنی تو بولیں: "کون، میاں؟"

میں نے کہا: "جی۔"

کہنے لگیں: "یہ رتجگا کیوں ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا: "رتجگا!"

کہنے لگیں: "یہ اس وقت باتوں کی آوازیں کیوں آ رہی ہیں۔ چار بجے ہوں گے۔"

میں نے کہا: "نہیں دو۔"

بولیں: "اتنی رات گئے جاگ کیوں پڑ گئے؟"

میرا ارادہ تھا کہ خالہ جانی سے جھوٹ نہیں بولوں گا. جو کچھ ہوا ہے انہیں صاف صاف بتا دوں گا. مگر نہ جانے کیوں جب وقت آیا تو میں گھبرا گیا۔ اور میں نے جھوٹ بول دیا: "محلے کی ایک لڑکی بھاگ گئی۔"

خالہ جانی کراہ رہی تھیں۔ ان کا کراہنا بند ہو گیا۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں نے بڑھ کر مدد کی۔ تو مجھے پتہ چلا کہ ان کا جسم پھنک رہا ہے۔

"آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔"

"ہاں بیٹا یہ کمبخت بخار پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہاں تو کون لڑکی بھاگ گئی؟"

میں اس سوال کے لئے یا تو تیار نہیں تھا اور اگر تھا تو پوری طرح سے نہیں۔ کیونکہ پہلا نام جو میرے ذہن میں آیا وہ نکہت کا تھا اور میں نے یہی نام خالہ جانی کو بتا دیا۔

نکہت کا نام سنکر ان کے چہرے پر انہماک کی چھوٹ بہت واضح ہو گئی۔ انہوں نے بڑے پُر معنی انداز میں "اچھا" کہا اور پھر پوچھا "کس کے ساتھ؟"

پھر بغیر سوچے سمجھے میں نے کہہ دیا "اپنے نوکر کے ساتھ۔"

وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"نادر کے ساتھ! سچ!"

میں نے کہا "جی۔"

"لونڈیا کا دل آ گیا ہو گا اس پر۔"

میں چپ رہا۔

"تھا تو نوکر مگر تھا بڑا بانکا جوان۔"

میں پھر چپ رہا۔

"اس کے باوا اماں آئے ہوں گے اسے ڈھونڈھنے؟"

میں نے کہا "جی۔"

"ہیں ابھی؟"

میں نے کہا "جی۔"

"چلو۔ مجھے نیچے لے چلو۔"

میں گھبرا گیا۔

"آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ باہر بہت سردی ہے۔ ایسے میں آپ کو باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔"

وہ میری بات مان گئیں مگر انہوں نے مجھے روک لیا اور پورے بیس منٹ تک مجھ سے اس بھاگ جانے کے واقعے کی تفصیلات دریافت کرتی رہیں۔ کراہتی جاتی تھیں مگر سوال پوچھے جا رہی تھیں۔ مجھ سے جتنا جھوٹ بولا گیا بولتا رہا۔

میں چلنے لگا تو خالہ جانی نے ایک سوال اور کیا۔

"زمرد کیا کر رہی ہے؟"

میں نے جواب دیا۔

"وہ بھی جاگ رہی ہے۔"

دوسرے دن صبح امّی جان خالہ جانی سے سچ بولنے گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ خالہ جانی کو موت آ چکی ہے۔

قصّہ مسمّاۃ پھولؔ وتی کا

نئی دہلی۔ سنہ ۱۹۵۶ء

نئی تحریریں ۔ لاہور

کہانی بے حد اچھی ہے۔

فکر تونسوی

شام کا وقت تھا۔ بڑا سہانا موسم تھا۔ پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ اتفاق نے میری مدد کرنا چاہی اور دیو ندر آن ٹپکا۔

میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "پیو گے؟"

کہنے لگا۔ "نہیں۔"

مجھے بڑا تعجب ہوا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے دیو ندر کو شراب پیش کی ہو اور اس نے میری پیش کش کو ٹھکرا دیا ہو۔ وہ میرا جگری دوست ہے۔ ہمارے درمیان کسی قسم کا تکلف نہیں۔ شراب وہ بھی پیتا ہے اور میں بھی۔ وہ زیادہ میں کم۔ وہ دیسی بھی پیتا ہے لیکن میں اسکاچ سے نیچے نہیں آتا۔ وہ لیکچرار ہے، تین سو روپے ملتے ہیں۔ بیوی ہے۔ دو بچے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر روز اسکاچ نہیں پی سکتا۔ روز اسکاچ میں بھی نہیں پی سکتا۔ لیکن میں اسی وجہ سے اسکاچ پیتا ہوں کہ روز نہیں پیتا۔ اور اسی وجہ سے میں اس کی دیسی کو رَد کر دیتا ہوں لیکن وہ میری اسکاچ کو کبھی رَد نہیں کرتا۔

میں نے کہا "خیر تو ہے؟"

وہ مسکرانے لگا۔

میں نے کہا۔ "کچھ پھوٹو گے بھی!"

بولا۔ "یار بات یہ ہے کہ آج ایک جگہ پینے کی دعوت ہے بس تھوڑی دیر میں

چلا جاؤں گا۔ تمھارے ساتھ پی لی تو پھر وہاں کیا خالی سوڈا پیوں گا۔"

"تو یوں کہو نا۔ کہاں ہے دعوت؟"

یہیں، وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ اس نے اپنے کسی دوست کا نام بھی لیا۔ لیکن اس طرح کہ جھوٹ چھپنے کی بجائے اور واضح ہو گیا۔

"ابے یہ کیا حرکت! جھوٹ اور وہ بھی مجھ سے؟"

وہ مسکرانے لگا۔

میں نے کہا۔ "اگل دو جو کچھ اگلنا ہے۔ جھوٹ سے کام نہیں چلے گا۔ میں ایسے چھوڑنے والا نہیں۔"

اس نے سگریٹ سلگائی۔

"یار بات یہ ہے کہ مجھے عشق ہو گیا ہے۔"

وہ شرما رہا تھا۔

"بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک لونڈیا کو مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔"

میں اچھل نہیں پڑا کیونکہ عشق کی وارداتیں دیوندر کی زندگی میں بہت سی ہو چکی ہیں۔ شکل وصورت بہت اچھی پائی ہے۔ اور چہرے پر ایک دائمی شرم کلنٹے کا کام دیتی ہے۔

"پھر پھنس گئی، کالج کی کوئی لونڈیا؟" میں نے بات بڑھانے کے خیال سے پوچھا۔

"اس بار ایک طوائف مرمٹی ہے۔ تیرے دوست پر۔"

میں پھر بھی نہیں اچھلا کیونکہ طوائفوں کے محلّے میں دیوندر کی دوستی اچھی خاصی ہے حالانکہ اس سلسلے میں عشق کا ذکر وہ پہلی بار کر رہا تھا۔

"میں نے کہا چلو اسی طرح کچھ بچت ہو جائے گی۔"

اس نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کے چہرے پر ایک ابر سا آیا اور گزر گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ اسے میرا جملہ اچھا نہیں لگا۔

"یہ تو خیر میں نے مذاقاً کہہ دیا۔ لیکن اب پہیلیاں نہ بجھواؤ اور صاف صاف بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔"

اس فرمائش کے جواب میں میں نے پہلی بار پھول وتی کا نام سنا۔ دیوندر نے بتایا کہ نئی نئی آئی ہے۔ وہ دو تین بار تماشبین کی حیثیت سے گیا اس کے پاس۔ اس کے بعد اُسے عشق ہو گیا۔ پھول وتی کو دیوندر سے۔ اور اس نے دیوندر سے پیسے لینا بند کر دیئے۔ پھر اس کی خاطر مدارت بھی شروع کر دی۔ یعنی اس کے لئے شراب کا انتظام کرنے لگی اور ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچی کہ دیوندر کی موجودگی میں تمام "تماشبینوں" کا بائیکاٹ ہونے لگا۔ جب تک وہ اس کے پاس رہتا، گھنٹہ دو گھنٹے، یا رات کے بارہ ایک بجے تک پھول وتی کا دروازہ "تماشبینوں" کے لئے بند رہتا۔

"یہ ٹھاٹ ہیں" میں نے دیوندر کی داستان سن کر کہا۔

پھر وہی قاتل شرم اس کے چہرے پر کھیلنے لگی۔

"آج بھی اس سے وعدہ ہے۔ جاؤں گا تو پلائے گی ضرور۔ اور اگر نہیں پیوں گا تو بُرا ماننے گی۔ حالانکہ وہ سولن پلاتی ہے۔ اور تم اسکاچ پلاؤ گے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں میرے دوست۔ جاؤ عیش کرو۔ میری اسکاچ میں وہ مزا کہاں جو پھول وتی کی سولن میں ہو گا"

اور "ہائے پھول وتی" کہہ کر میں نے اسے کمرے سے نکال دیا۔

وہ چلا گیا۔ ہنستا ہوا۔ مجھے گالیاں دیتا ہوا۔

اس کے بعد میں دو تین مرتبہ شام کے وقت دیوندر کے گھر گیا مگر وہ نہیں ملا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ کہاں گیا ہے۔ ہم دونوں ان دنوں اردو ادب میں رنڈی کے موضوع پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ اس لئے اس کی غیر موجودگی مجھے بہت کھلی۔ کیونکہ میں چاہتا تھا کہ مقالہ جلد از جلد ختم ہو جائے تاکہ ہم اسے اپنی انجمن کی آئندہ نشست

کے سامنے پیش کر سکیں۔

ایک دن شام کو میں نے اسے جا لیا۔ اگر چند منٹوں کی دیر ہو جاتی تو نہ ملتا۔ گھر سے نکل رہا تھا کہ میں پہنچ گیا۔

کہنے لگا۔ "چلتے ہو؟"

میں نے پوچھا۔ "کہاں؟"

"بھول وتی سے ملنے۔"

میں تو بھول ہی گیا تھا کہ بھول وتی سے معاشقہ چل رہا ہے دیوندر کا ان دنوں۔

"تبھی سرکار اتنے دنوں غائب رہے۔"

"بات یہ ہے کہ شامیں آج کل زیادہ تر وہیں گزرتی ہیں۔ تم بھی چلو۔"

میں نے انکار کر دیا۔ مجھے فرصت نہیں تھی۔ اور پھر میں تو مقالے پر بات کرنے آیا تھا، لیکن اس کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ فی الحال دیوندر کو مقالے سے زیادہ بھول وتی سے شغف ہے۔ اس نے مجھ سے مقالے کے بارے میں دو ایک باتیں کیں تو مگر بے دلی کے ساتھ۔ اس لئے میں نے خود ہی موضوع بدل دیا اور اس سے بھول وتی کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

وہ کہنے لگا۔ "بڑا نرالا تجربہ ہے۔ اس عشق کا۔"

"کیوں نہ ہو گا پہلی مرتبہ جو ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ تمھیں بھی ہے عشق وشق ہے یا معاملہ یک طرفہ ہے؟"

"یار کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کچھ کشش تو معلوم ہوتی ہے۔ تبھی تو ہفتے میں کم از کم تین چار بار کھنچا چلا جاتا ہوں اس کے ہاں۔"

"اور وہ؟"

"اس کی بات نہ کرو۔ وہ تو غوطے کھا رہی ہے۔ تمھیں معلوم ہے۔ اس نے ایک

فلیٹ لے لیا ہے میرے لئے ۔"

"تو کیا پہلے فٹ پاتھ پر رہتی تھی !"

"گدھے ہو نرے ۔ فٹ پاتھ پر تو نہیں رہتی تھی لیکن اپنا فلیٹ بھی نہیں تھا۔ ایک فلیٹ میں کئی مل کر رہتی تھیں ۔ ایک کمرہ اس کا تھا ۔"

"تو پھر فلیٹ لینے کی کیا سوجھی اسے ، رنڈی کے لئے ایک کمرہ بہت ہوتا ہے ۔"

اس کا منہ پھولنے لگا ۔

"پھول وتی کو رنڈی مت کہا کرو ۔"

میں ہنسنے لگا ۔

"تو پھر کیا کہا کروں ؟"

"پھول وتی ۔"

"اچھا ۔ تو پھول وتی صاحبہ کے لئے ایک کمرہ کیوں کافی نہیں تھا ؟"

کافی تو تھا مگر مکمل تنہائی نہیں تھی ۔ تماشبینوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا ۔ سکون سے بیٹھ نہیں سکتے تھے ، ایک دن تو ایسا ہوا کہ ہم لیٹے ہوئے تھے کہ پردہ اٹھا کر ایک تماشبین اندر گھس آیا ۔ اور پھر شور و غل الگ ۔ پاس والے کمرے میں گانا بجانا ہوتا تھا ۔

"تو آپ کی پھول وتی کو آپ سے اتنا عشق ہے کہ اس نے آپ کے لئے ایک الگ فلیٹ لے لیا ۔"

"ہاں ۔ اور تمھیں پتہ ہے کہ کتنا کرایہ دیتی ہے اس فلیٹ کا ۔ دو سو روپے ۔ دو کمروں کا فلیٹ ہے ۔ اس کے دو سو روپے ۔"

"بڑی نرالی ۔۔۔ " میں کہنے والا تھا ۔ "رنڈی معلوم ہوتی ہے ۔" مگر سنبھل گیا ۔

"بڑی نرالی عورت معلوم ہوتی ہے تمہاری پھول وتی ۔"

"کچھ پوچھو مت ۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑی جذباتی عورت ہے ۔ اور

اس پیشے میں آنے کے بعد بھی اس کے جذبات مرے نہیں۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش اتنی شدید ہے اس میں کہ کبھی کبھی تو میں گھبرا جاتا ہوں۔ شاید یہ پہلا موقع ہے کہ اسے اپنے جذبات کی آسودگی حاصل ہو رہی ہے۔"

دیوندر نے مجھے اس کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتایا۔ خاندانی طوائف نہیں۔ بھٹک کر آگئی ہے اس پیشے میں۔ یہ دیوندر کو بھی معلوم نہیں تھا کہ کیوں بھٹکی اور کس نے بھٹکایا۔ اسے، یہ اسے ضرور معلوم تھا کہ پیشہ کرتے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، لیکن بالکل نئی بھی نہیں۔ دو تین سال تو ہو چکے ہوں گے کم از کم۔

بس اسٹاپ آگیا اور میں دیوندر کو چھوڑ کر اپنی راہ ہولیا۔

ایک روز صبح سویرے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پریشان نظر آرہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے کھوئے کھوئے سے نظر آرہے ہو۔"

"یار اچھی خاصی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"کیا ہوا؟"

"بیوی کو پتہ چل گیا۔"

میں چونکا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ بھابی کو پتہ چل گیا کہ تمہارا پھول وتی سے معاشقہ چل رہا ہے؟"

"یہ تو پتہ نہیں چلا کہ معاشقہ کس سے چل رہا ہے۔ مگر یہ ضرور شبہ ہو گیا ہے اسے کہ میں کسی دَر کے چکر کاٹ رہا ہوں۔ کئی روز سے کچوکے لگا رہی تھی۔ یہ روز شام کو کس باغ کی سیر ہوتی ہے۔ آندھی آئے، طوفان آئے، بارش ہو مگر آپ کا یہ شام کا پروگرام نہیں رکتا۔ مگر کل تو اسے ثبوت بھی مل گیا۔"

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ہوا یہ کہ کل رات جب میں گھر واپس جا کر کپڑے بدل رہا تھا تو اُسے بنیان پہ لپ اسٹک کا نشان نظر آگیا۔ میں نے بہت جھوٹ بولا مگر اس کی تسلی نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے بھلا عورت نہیں پہچانے گی لپ اسٹک کے نشان کو تو کیا ہم تم پہچانیں گے۔"

میں نے کہا۔" بجا ارشاد فرمایا سرکار نے۔ مگر یہ تو بتائیے کہ اب ارادے کیا ہیں؟"

" یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔"

" اس میں سمجھ میں آنے کی کیا بات ہے۔ خیریت چاہتے ہو تو پھول وتی کو طلاق دے دو، ورنہ بھابی تمہیں طلاق دے دیں گی۔"

" اتنا آسان ہوتا تو کیا کہنے تھے۔"

" یعنی حضرت پر عشق کا بھوت باقاعدہ سوار ہو گیا تھا۔ ایے ہوش کے ناخن لے۔ اور اب بس کر۔ بہت کر چکا عشق۔ تفریح ہو گئی۔ اب چھوڑ اس لونڈیا کو اور بیٹھ آرام سے گھر، ورنہ بنا بنایا گھر اُجڑ جائے گا۔ تعجب ہے کہ تیری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بھابی اور پھول وتی میں سے کسے چُنے!"

" تُو تو بکواس کر رہا ہے۔" وہ جھلا گیا۔" چُننے نہ چُننے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ بات تو اتنی سی ہے کہ کسی طرح تیری بھابی کا شُبہ دُور ہو جائے۔ یہ کوئی ضروری ہے کہ میں پھول وتی سے ملنا چھوڑ دوں۔ اور پھر مجھے اس کے جذبات کا بھی تو خیال کرنا ہے۔"

" اس کے جذبات کا خیال بھی کرنا ہے تو کم از کم اتنا تو کر سکتے ہو کہ ایک لمبا غوطہ کھا جاؤ۔ نہ جاؤ اس کے پاس پندرہ بیس روز۔ اس طرح بھابی کا شُبہ دُور ہو جائے گا۔ پھر شروع کر دینا پھول وتی کے گھر کے چکر۔ مگر آئندہ لپ اسٹک کا ٹھپہ لے کر نہ آنا ورنہ خیر نہیں!"

وہ ہنسنے لگا اور جانے سے پہلے وعدہ کر گیا کہ میری نصیحت پر عمل کرے گا۔

جانے لگا تو میں نے کہا۔ "اگر اس دوران میں پیاس زیادہ لگے تو میرے پاس آجانا میں پلا دوں گا۔"

کوئی ہفتے بعد میں اس کے گھر گیا۔ وہ فوراً مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اور بولا۔ "یار تُو نے عجب علت میں پھنسا دیا۔"

میں نے کہا۔ "خیر تو ہے۔"

"خیر ہی تو نہیں! دیکھ بات یہ ہے کہ میں نے تیری نصیحت مان کر پھول وتی کے ہاں آنا جانا بند کر دیا۔ دو دن تو کچھ نہیں ہوا، تیسرے روز اس کا قاصد آن دھمکا۔ ایک لونڈا ہے جو اس کو کھانا وغیرہ لا کر دیتا ہے۔ اسے بھیجا اس نے۔ بھائی کیوں آئے ہو؟ بلایا ہے آپ کو بی جی نے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ میں نے پھول وتی کو بتا دیا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں ورنہ شاید وہ خود آن دھمکتی۔ ٹالنے کے بعد میں نے کہہ دیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ بی جی سے کہہ دینا کل آؤں گا۔ کل آئی اور نکل گئی مگر میں نہیں گیا۔ پرسوں قاصد پھر آیا۔ میں نے پھر ٹالا۔ چوتھے دن شام کو کیا دیکھتا ہوں کہ پھول وتی میری کھڑکی کے سامنے سڑک کے اس پار فٹ پاتھ پر کھڑی ہے اور مجھے اشارے کر رہی ہے۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ اگر تیری بھابی دیکھ لیتی تو قیامت آجاتی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس سے کہا کہ لوٹ جائے۔ مگر اس نے ہٹنے کا نام تک نہیں لیا۔ پہلے تو سوچا نیچے اتر جاؤں جا کر، مگر پھر ہمت کر کے میں نے کھڑکی بند کر دی اور سوراخ میں سے جھانکتا رہا۔ وہ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد چلی گئی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا۔"

"جیو میرے لال۔ بڑے ہمتی نکلے۔ مگر معلوم ہے اب کیا کرنا چاہیے تمھیں؟"

"کیا؟"

"فوراً جا کر اس سے ملنا چاہیے۔ جانتے ہو کیوں؟"

وہ بدستور حیرت زدہ نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا۔

"اس لئے اگر فوراً نہیں ملے تم اس سے تو ایک دن وہ تمہارے گھر میں بیٹھی ہوگی۔"

وہ چونک پڑا۔

میں نے کہا۔ "جھوٹ نہیں کہتا ہوں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہو آؤ۔ اس کے پاس تھوڑی دیر عشق و محبت بھی کر لینا۔ اور یہ بھی سمجھا دینا اُسے کہ تمہاری غیر حاضری کا سبب کیا ہے۔ اور یہ بھی کہ اگر صبر سے کام نہیں لیا تو سارا کھیل خراب ہو جائے گا۔"

وہ خوش ہو گیا۔

"یار تو کہتا تو ٹھیک ہے"۔

"پر دیکھ۔ لپ اسٹک وغیرہ سے ہشیار رہیو!"

وہ مسکرانے لگا۔

اس کے بعد میں نے دستور بنا لیا کہ جب بھی دیو ندر سے ملاقات ہوتی پھول وتی کا ذکر ضرور کرتا۔ اگر پھول وتی سے ملے دو تین روز گزرے ہوتے تو وہ کافی دیر تک اس موضوع پر گفتگو کرتا۔ اور اگر ملاقات تازہ ہوتی تو چند جملوں میں بات ختم ہو جاتی، ایک ایسی ہی طویل گفتگو کے دوران میں اس نے مجھے بتایا کہ پھول وتی نے پیشہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔

"کیا مطلب تمہارا؟"

"یہ کہ اب اس کے دروازے تماشبینوں کے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔"

"خرچ کیسے چلتا ہے پھر اس کا؟ اور خاص کر تمہارا۔ شراب تو ذرا مہنگا نسخہ ہے۔ معلوم نہیں خود بھی پیتی ہے کہ نہیں۔"

"پیتی تو ہے مگر صرف میرے ساتھ۔"

"تو پھر اب یہ شوق کیسے پورے ہوں گے؟ اور فلیٹ کا کرایہ کہاں سے آئے گا؟

اور اس کا پیٹ کیسے بھرے گا؟ تم سے کوئی سمجھوتہ تو نہیں ہو گیا؟"

"توبہ کرو! میرا اپنا گزارہ نہیں ہوتا تین سو روپلی میں۔ اسے کیا دوں گا اور کیسے دوں گا؟"

"تو پھر؟"

"میں نے پوچھا تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ گانٹھ کی پوری ہے۔ یہاں آنے سے پہلے کسی سیٹھ کے پاس تھی۔"

"لیکن ایسے کام کب تک چلے گا؟ کوئی قارون کا خزانہ تو نہیں اس کے پاس کہ ختم ہی نہ ہو۔"

"یہ تو بھگوان جانیں یا وہ۔"

کوئی دو ڈھائی مہینے بعد دیوندر نے بتایا کہ نوبت اب زیوروں تک آگئی ہے بھول وتی نے تو اس سے چھپایا مگر اس کے یہاں جو لونڈا نوکر ہے اس نے دیوندر کو بتا دیا کہ بی جی آج کل اپنے زیور بیچ رہی ہیں۔ ایک ایک کر کے، لیکن اس نے دیوندر کی خاطر مدارات میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے دی۔ سولن کی بوتلیں آتی رہیں اور کھلتی رہیں۔ اور دیوندر اور بھول وتی کا عشق پی پی کر جھومتا رہا۔ حتیٰ کہ کان کی بالیاں تک بک گئیں۔ یہ بھی اسے بھول وتی کے نوکر نے بتایا اور بھول وتی کے ننگے کان دیکھ کر دیوندر نے نوکر کی بات کا یقین کر لیا۔ لیکن سولن کی بوتلیں پھر بھی بند نہ ہوئیں۔

میں نے پوچھا۔ "جب آخری زیور بھی بک گیا تو بوتلیں کیا اپنے آپ چل کر آگئیں۔ اس کے فلیٹ میں!؟"

دیوندر نے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ بھول وتی نے پھر بیشہ شروع کر دیا؟"

"تم تو بھگوان کی دیا سے کافی سمجھدار ہو!"

"تمہیں معلوم ہے۔ یہی سوال میں نے پھول وتی سے کیا۔"

"کیا جواب دیا اس نے؟"

"گنگا جلی اٹھانے کو تیار ہو گئی۔"

"اور تم نے یقین کر لیا؟"

وہ مسکرانے لگا۔

"اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اس قدر سچے جھوٹ کا یقین نہ کرنا بد ذوقی کا ثبوت ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے یہ جھوٹ اُس سے میں نے ہی بلوایا۔"

"وہ کیسے؟"

بولا۔

"ایک رات باتوں باتوں میں میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ پھول وتی تم مجھ سے اتنا پریم کرتی ہو تو پھر تمہارا جی کسی دوسرے آدمی کے ساتھ سونے سے انکار نہیں کرتا؟ اور دوسرے دن اس نے پیشہ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ میں نے تو یہ بات یونہی کہہ دی تھی۔"

"اچھا اُلّو پھانسا ہے تو نے۔" میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ایسا نہ کہو یار۔ اس کی اس بات کا مجھ پر بڑا اثر ہوا ہے۔"

"تجھ پر اثر ڈالنے کے لئے ہی تو اس نے یہ بات کی۔ طوائفوں کو بڑے بڑے گُر آتے ہیں رجھانے کے۔ کہیں تیرے گھر کی ملکہ بننے کے ارادے تو نہیں اس کے؟"

"تیری تو مت ماری گئی ہے۔ اس نے آج تک کوئی ایسی بات کی ہی نہیں جس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا جو تو نکال رہا ہے۔"

"سمجھا دیا بچو۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام۔ میری مانو تو ایک دن موقعہ پا کر اس کے ٹرنک میں جھانک لینا۔ شاید بکے ہوئے زیور تمہیں وہیں مل جائیں۔"

معلوم نہیں اس نے میری نصیحت پر عمل کیا کہ نہیں کیونکہ اس کے بعد جب میری ملاقات دیوندر سے ہوئی تو وہ ایک ایسا دکھڑا لے بیٹھا کہ میں ٹرنک والی بات نہ پوچھ سکا۔

بالکل فلمی انداز میں اس کا ایک رقیب پیدا ہوگیا تھا۔

کہنے لگا۔ "چار دن سے بہت بُرا حال ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں!"

اس تمہید کے بعد اس نے سر پکڑ کر مجھے بتایا کہ اس کا رقیب ایک بھڑوا ہے۔ پاس والے فلیٹ میں جو رنڈی رہتی ہے اس کا آدمی۔

میں نے پوچھا۔ "تمہیں پتہ کیسے چلا؟"

"خود پڑوسی رنڈی نے بتایا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولے گی۔"

"شاید حسد کے جذبے کے تحت جھوٹ بول دیا ہو اس نے۔"

"حسد کا ہے کی۔ میرا اس سے تعلق نہ تھا اور نہ ہے۔ عرصہ گزرا دو ایک دفعہ اس کے پاس گیا تھا۔ بس اور وہ تو خود دیوانی ہے اپنے آدمی کے لیے کما کما کر کھلاتی ہے اسے۔ تبھی تو اس سے برداشت نہیں ہوا اور اس نے مجھے بتا دیا۔"

"مگر پھول وتی کو یہ سوجھی کیا کہ پروفیسر کو چھوڑ کر بھڑوے پر لٹو ہوگئی۔"

"یہی تو غضب ہے کہ اس نے مجھے چھوڑا نہیں لیکن ساتھ ساتھ اس آدمی سے بھی تعلق رکھا۔"

"شاید وہ اس کا تماشبین ہو۔"

"یہی جواب اس نے بھی دیا۔ لیکن اوّل تو طوائفوں کے بھڑووں سے تماشبینوں والے تعلقات نہیں ہوتے اور پھر اس کی پڑوسن نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ وہ رات کو کافی دنوں سے اس بھڑوے کے ساتھ سوتی ہے، میرے چلے جانے کے بعد اور پیشے کا وقت ختم ہونے کے بعد۔"

میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ پھول وتی کا نہ جانے کن کن مردوں سے سابقہ پڑ چکا ہے شاید دیوندر صرف اس کے جذبات کی تسکین کم پاتا ہو۔ لیکن میں نے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔

"تو پھر کیا ارادے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے قسم کھائی ہے کہ اب وہ کبھی اس آدمی سے نہیں ملے گی۔ یہ تو خیر وہ مانتی ہی نہیں کہ اس کے تعلقات ہیں اس آدمی سے۔ وہ تو کہتی ہے کہ وہ بھی ایک تماشبین ہے۔ لیکن مجھے اگر یہ پسند نہیں کہ وہ اس کے ساتھ تماشبینی کرے تو وہ اس کو اپنے گھر میں قدم تک نہ رکھنے دے گی۔"

میں نے کہا۔ "ان شرائط پر تو سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔"

کہنے لگا۔ "ہاں انہی شرائط پر ہوا ہے۔"

لیکن اس کی بات سن کر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اسے اس سمجھوتے کی کامیابی کی امید نہیں جس طرح انسان کو اپنی کمزوری چھپاتے وقت یقین نہیں ہوتا کہ کمزوری چھپ سکے گی۔

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ کیونکہ اس کے بعد جب میں دیوندر سے ملا تو وہ بہت ہی زیادہ پریشان تھا۔

کہنے لگا۔ "دو دن سے کالج نہیں گیا ہوں۔"

بات یہ ہوئی تھی کہ پڑوسی رنڈی نے اسے بتایا تھا کہ وہ آدمی اب بھی رات کو پھول وتی کے پاس سوتا ہے۔ پہلی دفعہ تو دیوندر نے معاف کر دیا تھا، مگر اس دفعہ...

"... اتنا مارا ہے اسے میں نے۔ اتنا مارا ہے کہ میری باٹا کی چپل ٹوٹ گئی۔ میرے ہاتھوں میں درد ہونے لگا۔ اس کے سارے بدن پر نشان پڑ گئے۔ میں نشے میں دھت تھا۔ پڑوسن کی بات نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی، پھول وتی کے پاس

گیا تو سالی نے سولن کا آدھا نکالا۔ آدھا ختم کر کے میں نے بات شروع کی، وہ پھر وہی تماشبین والی بات لے بیٹھی۔ انگیا میں سے دس کا نوٹ نکال کر دکھانے لگی کہ یہ اس آدمی نے دیا ہے۔ میں نے کہا سالی۔ اوّل تو میں تیری بات مانتا نہیں اور اگر اس نے تجھے روپے دینے بھی تیری ـــــ" یہاں اس نے ایک ایسا فقرہ کہا جو میں نقل نہیں کر سکتا۔۔۔" تو تو نے لئے کیوں؟ تو نے اُسے آنے کیوں دیا اپنے گھر، جبکہ تو نے قسم کھائی تھی کہ اب تو اُسے اپنے گھر میں قدم تک نہ رکھنے دے گی۔ بھلا کیا جواب دیتی۔ چپ ہو گئی اور سر جھکا لیا۔ اور پھر جو برسی ہے اس کے سر پہ اور اس کے بدن پہ میری چپل تو" ٹھکائی کرنے اور گالیاں دینے کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ ہرگز ہرگز بھول دتی کی دہلیز پار نہیں کرے گا۔

"چلو تمہاری گلو خلاصی ہو گئی ورنہ بات نامعلوم کہاں تک پہنچتی۔"

"میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ پتہ نہیں کیا انجام ہوتا۔ میں نے کئی لوگوں کو دیکھا ہے کہ رنڈی کے عشق میں اسی کے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اسی کے گھر پہ بوریا بستر جما دیتے ہیں۔ وہ کماتی ہے اور یہ کھاتے ہیں، یہ بھی کوئی سالی زندگی ہوئی۔ اور یہ بھی کوئی محبت ہوئی۔"

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت!"

"لیکن میری جان اسی وجہ سے تو عذاب میں ہے کہ بخیر نہیں گذشت۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ اس حرامزادی نے پھر میرے گھر کے چکر لگانا شروع کر دیئے ہیں، چار دن ہونے آتے ہیں اس بات کو، روز صبح اور شام جب میں گھر پہ ہوتا ہوں، آ کر کھڑی ہو جاتی ہے سڑک کے اس پار۔ عین میری کھڑکی کے سامنے۔ کھڑکی کھولتا ہوں تو اشارے کرتی ہے۔ ہاتھ جوڑتی ہے۔ بند کر لیتا ہوں تب بھی نہیں ٹلتی۔ کل پورے دس بجے

ٹی ہے۔ سامنے چائے کی دکان پہ بیٹھی رہی۔ میں سوراخ میں سے جھانک جھانک کر دیکھتا رہا۔"

"یہ تو سنگین معاملہ ہے۔ گھر میں اور کھڑکیاں بھی تو ہیں۔ کس کس کو بند کرتے پھرو گے۔ بھابی کی نظر پڑ گئی یا کسی پڑوسی نے دیکھ لیا اسے اشارے کرتے تو بات پھیل جائے گی استاد!"

"یہی تو میں بھی سوچتا ہوں۔"

"تھوڑی دیر تک وہ بھی خاموش رہا اور میں بھی۔ پھر میں نے کہا۔" ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ اس کے پاس پھر جاؤ اور اسے سمجھاؤ۔ کہ اس حرکت سے باز آئے۔"

یہ تو میں نے بھی سوچا مگر اس میں ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ وہاں لین دین ہونے لگے گا۔ وہ فوراً وعدہ کر لے گی۔ اب کبھی میرے گھر کے چکر نہیں کاٹے گی، مگر اس وعدے کے بدلے میں مجھے بھی وعدہ کرنا پڑے گا کہ میں اس کے ہاں بدستور آتا جاتا رہوں گا۔"

"کچھ روز یہ بھی کر کے دیکھو۔"

"کچھ روز کی بات نہیں، جونہی جانا بند کیا وہ پھر آن دھمکے گی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اب میرا جی کھٹا ہو گیا اس سے۔"

"اس آدمی کی وجہ سے۔"

"یونہی سمجھ لو۔"

اسی روز شام کو دیوندر میرے گھر آیا۔ اُسے ایک ترکیب سوجھی تھی۔ میری رائے لینے آیا تھا اور میری مدد بھی۔

ترکیب یہ تھی کہ ملک میں جو اتنے بہت سے ناری نکتین یا ویمنز ہومز کھلے

ہوئے ہیں کیوں نہ اُن میں سے کسی ایک میں پھول وتی کو داخل کر دیا جائے۔ دیو ندر کو اس ترکیب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میری مدد کی ضرورت اس لئے تھی کہ میں ایسے کئی سوشل کارکنوں کو جانتا ہوں جن کے ذریعہ اس قسم کا کام نکل سکتا ہے۔

ترکیب اچھی تھی۔ پھول وتی کو کسی ناری نکیتن میں داخل کر دیا جائے جہاں اس کی دیکھ بھال ہو۔ اُسے باعزت شہری بن کر رہنا سکھایا جائے۔ اُسے کوئی ہُنر سکھایا جائے تاکہ وہ باعزت طریقے سے اپنا پیٹ بھر سکے اور اگر ممکن ہو تو اس کی شادی کر دی جائے۔

دیو ندر کو یہ ترکیب اس لئے سوجھی تھی کہ اس نے ایک دن پھول وتی سے باتوں باتوں میں اس کی رائے اس قسم کے مستقبل کے بارے میں دریافت کی تھی اور پھول وتی نے جواب دیا تھا کہ اگر دیو ندر اس کے لئے یہی مناسب سمجھتا ہے تو وہ ہرگز انکار نہ کریگی۔
ترکیب میں قباحت صرف اتنی تھی کہ یہ پتہ نہیں تھا کہ پھول وتی اب بھی اس قسم کے مستقبل کے لئے تیار ہو گی یا نہیں۔ مگر دیو ندر کا خیال تھا کہ وہ تیار ہو جائے گی۔

"اگر وہ راضی ہو گئی تو میں یہ کام منٹوں میں کروا دوں گا۔"

"لیکن یہاں نہیں کسی اور شہر میں انتظام کرانا پڑے گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ یہاں رہے۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میں اُسے آگرے بھجوا دوں گا۔"

تو ہمارے درمیان طے پایا کہ دیو ندر پھر پھول وتی کے ہاں آنا جانا شروع کرے اور آہستہ آہستہ اُسے راہ پر لے آئے اور ایسا ہی ہوا، وہ پھول وتی کو راہ پہ لانے میں کامیاب ہو گیا۔

جس دن دیو ندر نے مجھے یہ خبر سنائی اسی دن میں نے مس کملا سنگھ سے مل کر ساری تفصیلات طے کر لیں۔ اور یہ طے پایا کہ میں دوسرے دن پھول وتی کو اُن کے

پاس چھوڑ جاؤں، تاکہ وہ اُسے آگرے سے کر ناری نکیتن بھجوا دیں۔ میں نے انہیں دیوندر اور پھول وتی کے معاشقے کی بات نہیں بتائی اور نہ ہی یہ بتایا کہ پھول وتی رنڈی ہے کیونکہ ناری نکیتن والے رنڈیوں کو لینے سے گھبراتے ہیں۔ انہیں تلخ تجربے ہو چکے ہیں۔ یہ رنڈیاں ٹھہرتی نہیں اور ٹھہرتی ہیں تو نکیتن کے ماحول کو خراب کرتی ہیں۔ دوسری عورتوں پہ بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ میں نے تو اُن سے یہ کہا کہ پھول وتی ایک بیوہ غریب ہے۔ مصیبت کی ماری ہے، شرنارتھی ہے۔

میں نے دیوندر کو یہ خوش خبری سنائی تو اچھل پڑا۔ ہم نے طے کیا کہ دوسرے دن وہ پھول وتی کو ایک جگہ لائے گا اور وہاں سے میں اسے مس سنگھ کے پاس لے جاؤں گا۔

دوسرے دن مقررہ مقام پہ مقررہ وقت سے ذرا دیر بعد پہنچا۔ دیوندر اور ایک عورت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ اُن کے پاس ہی ایک ٹرنک اور ایک بستر رکھا ہوا تھا۔ دیوندر نے پھول وتی سے میرا تعارف کرایا۔ ایک تانگہ بلایا اور پھر اُسے میرے حوالے کر دیا۔ اور ہم دونوں پھول وتی اور میں مس سنگھ کے گھر کی طرف چل دیئے۔

اس دوران میں میں نے دو ایک بار پھول وتی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ سانولی رنگت، چھوٹی سی گردن۔ موٹے ہونٹ، پتلا چہرہ۔ آنکھیں قدرے بڑی۔ ہونٹوں پہ لپ اسٹک اور گالوں پہ سُرخی۔

میں نے کہا۔ "آپ سُرخی اور لپ اسٹک لگا کر جا رہی ہیں مس سنگھ کے پاس؟"

اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے تانگے والے سے کہا کہ تانگے کو فلاں سڑک پہ موڑے۔

میں نے کہا۔ "مگر یہ سڑک تو مس سنگھ کے گھر کو نہیں جاتی۔ یہ تو اسٹیشن جاتی ہے!"

"بابو جی۔ تبھی تو میں تانگے والے کو بولی کہ اس سڑک پہ موڑے۔"

وہ سگریٹ پی رہی تھی۔

"آپ کا مطلب؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی مس سنگھ کے پاس نہیں جا رہی۔ میں اسٹیشن جا رہی ہوں۔ وہاں سے گاڑی پکڑ کر آگرے چلی جاؤں گی۔"

"مگر ناری نکیتن میں اس طرح تو آپ کو کوئی گھسنے بھی نہیں دے گا۔"

"پر میں جا کب رہی ہوں ناری نکیتن۔ میں تو آگرے جا رہی ہوں کناری بازار"۔

میں گھبرا گیا۔ ساری اسکیم چوپٹ ہوئی جا رہی تھی۔ اور اس گھبراہٹ میں میرے منہ سے نہ جانے کیسے "لیکن" نکل پڑے۔

پھول وتی میری گھبراہٹ سے بہت محظوظ ہوئی۔ اور مسکرا کر بولی۔

"بابو جی۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ میں اس شہر کو چھوڑ رہی ہوں۔ آپ میرے سنگ اسٹیشن تک چلئے۔ ورنہ دیو ندر بابو سمجھیں گے کہ آپ مجھے کہیں رستے میں چھوڑ آئے یا میں رستے میں آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ آپ اسٹیشن چلیں گے تو تھوڑا سمے بیت جائے گا۔ اور دیوندر بابو سمجھیں گے کہ آپ نے مجھے ٹھکانے لگا دیا۔ آپ کو وشواس بھی ہو جائے گا کہ میں آگرے چلی گئی۔"

میں چپ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔ "اچھا۔ آپ یہ تو بتائیے کہ آپ کو ناری نکیتن میں داخل ہونا کیوں پسند نہیں؟"

وہ ہنسی۔

"بابو جی۔ بات یہ ہے کہ میں ایک دفعہ پہلے بھی رہ چکی ہوں ایک نکیتن میں۔ پر اس سمے میں چھوٹی تھی۔ وہیں تو آپ لوگوں کی سیوا کرنا سیکھا!"

پچیس کی ہوگی۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ لگایا۔

اسٹیشن آگیا۔ ہم دونوں تانگے سے اتر آئے۔ میں اس کے ساتھ ٹکٹ کی کھڑکی تک گیا۔ اس نے آگرے کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر مجھے دکھایا۔ میں جھینپ گیا۔

وہ کہنے لگی۔ "اب تو ہوگیا آپ کو وشواس؟"

میں کیا کہتا۔

وہ بولی۔ "آپ آدمی بھلے جان پڑتے ہیں۔ دیوندر بابو کی طرح۔ ایک کام کر دیں گے میرا؟"

میں نے کہا۔ "کہیے"

"واپس جاکر آپ دیوندر بابو سے یہ نہ کہنا کہ آپ نے مجھے اسٹیشن پر چھوڑا۔ ان سے بولنا سِنگھ کے پاس چھوڑا۔ آپ کو جھوٹ بولنا پڑے گا۔ پر اس میں نہ آپ کا نقصان ہو گا اور نہ دیوندر بابو کا۔ وہ چاہتے ہیں میں یہاں سے چلی جاؤں۔ سو میں جا رہی ہوں۔ اب ناری نکیتن جاؤں یا کناری بازار۔ ان کے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ ٹھیک بولتی ہوں نا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں"

"تو آپ بول دیں گے؟"

میں نے وعدہ کر لیا۔

"کھائیے دیوندر بابو کے سر کی سوگند۔ وہ آپ کے دوست ہیں نا!"

میں نے دیوندر کے سر کی سوگند کھالی اور چلا آیا۔

گھر آیا تو دیوندر میرا انتظار کر رہا تھا۔ سوالوں کی بارش کر دی اس نے میرے گھر میں گھستے ہی۔ اور میں نے اس کے ہر سوال کے جواب میں بڑی آسانی سے جھوٹ بول دیا۔

وہ بے حد خوش ہوا۔ اور "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کا نعرہ لگا کر کہنے لگا۔

"چلو پلاؤں تمہیں آج میرے دوست!"

بھول وتی سے ملنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ دیوندر نے پلانے کی پیش کش کی تھی۔
مگر میں نے اُسے ٹھکرا دیا۔

"میں نہیں پیتا تیری سولن۔"

"سولن نہیں۔ اسکاچ پلاؤں گا تجھے آج۔ اسکاچ! کیا سمجھا!"

اس شام ہم دونوں نے اتنی وہسکی پی کہ ہوش نہیں رہا۔

گلبی

نئی دہلی۔ ۱۹۵۵ء

نیا دور۔ کراچی

مجھے اب تک وہ SHOCK اور DISTASTE اور FASCINATION اور THRILL یاد ہے جو "گلبیا" پڑھ کر مجھ میں پیدا ہوا تھا۔ (DISTASTE شاید صحیح لفظ نہیں۔ لیکن اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ "گلبیا" نے مجھ میں جو EMOTIONAL UPSET پیدا کیا تھا اور آپ کے IMPERSONAL TONE بلکہ تقریباً CLINICAL TONE نے جس طرح مجھے دہلا دیا تھا اس کے لئے کیا لفظ لکھوں۔ انگریزی الفاظ کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ بات شاید اب بھی واضح نہیں کر سکا ہوں۔)

شمس الرحمٰن فاروقی ۔ ۱۹۸۹ء

"گلبیا" تو خیر کچھ اور ہی چیز ہے۔

ممتاز شیریں

آجکل یہاں کراچی میں آپ کے افسانے "گلبیا" کی بڑی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ہر طرف اسی کے تذکرے ہیں۔ اور اس کے چند جملے تو لوگوں نے زبانی یاد کر رکھے ہیں۔ اور اس کہانی کے متعلق تو یہ بھی سنا ہے کہ سرکاری حلقوں میں بڑی "مقبول" ہوئی ہے۔ بہر حال بڑی خوبصورت اور مزیدار کہانی ہے۔

مشفق خواجہ ۱۹۵۷ء

"جرا بچ کر رہنا بھیا۔ بڑی حرام جادی ہے سالی!"

شاید رام دھین نے جیسے سرونٹ کوارٹروں کی آبادی رمدھو کہا کہ تی بھی گلبیا کو میرے کوارٹر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے جاتے ہی آن دھمکا۔

میں سمجھ گیا اس کا اشارہ گلبیا کی طرف ہے، مگر میں نے انجان بن کر پوچھا "کون؟"

"بڑے بھولے جان پڑتے ہو بھیّا! وہی گلبیا اور کون!"

میں نے کہا "اوہ! گلبیا۔ ہاں ابھی ابھی گئی ہے۔"

"تبھی تو کھبردار کر رہا ہوں۔ ناگن ہے ناگن! سالی نے پروپھیسر کو ایسا پھانسا ہے اپنی جلفوں کے جال میں کہ بڈھا لٹو کی طرح ناچت ہے۔ انگلی پہ نچاتی ہے سالی۔ اور وہ ایسا بدھو ہے کہ ناچے جاتا ہے۔"

میں نے گفتگو جاری رکھنے کی خاطر کہا "ایسا!"

"اور نہیں تو کیا۔ میں نے تو کھبردار کر دیا۔ اب آگے تم جانو۔ اس کے کاٹے کا الاج نہیں!"

میں نیا نیا آیا تھا نوکروں کی اس بستی میں۔ کوئی پندرہ دن ہوئے ہوں گے۔ صاحب سلامت سب سے ہو چکی تھی سوائے گلبیا کے سو آج اس سے بھی ہو گئی۔ حالاں کہ اس کا ہماری بستی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سڑک کے دونوں طرف اور

جتنے بنگلے تھے ان کے نوکر کوارٹروں میں رہتے تھے۔ بس یہ گلبیا ایسی تھی جو کوارٹر میں نہیں رہتی تھی۔ بنگلے میں رہتی تھی۔ پروفیسر صاحب کے ساتھ۔

میں بیٹھا ہوا ڈربی جوتا جو مجھے چھوٹے صاحب نے دیا تھا چمکا رہا تھا کہ اندر گھس آئی۔

"تو ہی رمجانی ہے؟"

میں چونک پڑا۔ دروازے میں کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ سے کواڑ پکڑے۔ دوسرا کمر پہ رکھے۔ انگ انگ سے جوانی پھوٹی پڑتی تھی۔ گال تنے ہوئے۔ دیکھتے ہی جی چاہا بڑھ کر چٹکی لے لوں۔ گیہواں رنگت۔ ناٹا سا قد۔ گدرایا ہوا بدن۔ چوٹی سے ایڑی تک جوبن ہی جوبن۔

میں نے کہا "ہاں۔ میں ہی ہوں رمضانی۔"

وہ کوارٹر کے اندر آگئی۔

"میرا نام گلبیا ہے۔"

میں نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جا۔ میں جوتا چمکا لوں۔ پھر تجھ سے نمٹوں گا۔"

بالکل اناڑی لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا وقت کیوں خراب کروں۔ اس لئے میں نے یہ "نمٹوں گا" والا وار کر دیا۔

وہ کھاٹ کی پٹی پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تو کیا نمٹے گا۔ تجھ جیسوں کو تو میں تگنی کا ناچ نچا دوں۔"

یہ بات ہے۔ میں نے سوچا۔ اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ "تو تو مجھے غلط سمجھ بیٹھی۔ نمٹوں گا کوئی برا حرف تھوڑی ہے۔ بڑے بڑے شاعروں نے اسے باندھا ہے اپنے شعروں میں۔ وہ جو داغ کا شعر ہے...... یہ

"رہنے دے تو اپنے سیر۔ تو بھی اس بڈھے کی طرح مالوم پڑے ہے۔ ہر بکھت سیر۔ اور نہ جانے کیا کیا بکواس!"

"کون بڈھا؟" میں نے دایاں پیر ختم کر کے بایاں پیر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"بھی میرا بڈھا!"

"تیرا بڈھا! تو تیرا باپ بھی ہے!"

"بڑی مسکھری کرنی آوے ہے تجھے۔ باپ نہیں ہے تو کیا تیری طریوں بگیر باپ کے پیدا ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہوئی کہ بہہ پرلوک سدھار گیا۔"

"تو پھر کون سا بڈھا؟"

"بھی میرا مالک۔ پروبھ۔"

"یہ پروبھ کیا بلا ہوتی ہے۔ پروبھ نہیں پروفیسر۔"

"تو جیا وہ جانتا ہے کہ میں! اس کے سارے دوست اسے پروبھ کہتے ہیں۔ روج سنتی ہوں۔ کیسا بے ڈھنگا نام ہے!"

میں چپ ہو گیا۔ اب اس جاہل عورت سے کیا بحث کرنا جو ب کے نام بھالا نہیں جانتی۔ میں نے سوچا۔ گنوار کہیں کی مجھے سبق پڑھاتے آئی ہے۔ پانچ جماعتیں پڑھیں۔ ہمیشہ صاحب لوگوں کی بیراگیری کی۔

وہ چار پائی کی پٹی پر بیٹھی زور زور سے ٹانگیں ہلاتی رہی۔

"تجھے پالس کرنی تو کھوب آتی ہے۔ منس اپنا منہ دیکھ لے اس جوتے میں۔" اس نے دائیں پیر کے جوتے کو ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔

"تو نہیں چمکاتی اپنے پروبھ کے جوتے؟"

"میں کیوں چمکانے لگی اس کے جوتے! وہ کھود کر لیتا ہے آٹھویں دسویں روج پالس۔"

"تو پھر تیری نوکری تو مزے کی ہوئی!"

"اتی مجھے کی بھی نہیں جتنی تو سمجھے ہے۔ کھانا پکاتی ہوں۔"

"ایک آدمی کا کھانا پکانا بھی کوئی کام ہوا۔"

"کھالی کھانا تھوڑی پکاتی ہوں۔ سارا گھر میرے کندھوں پر ہے۔ سپھائی کرتی ہوں۔ جھاڑ پونچھ کرتی ہوں۔ پر وبھ کو سپھائی کا مرج ہے۔ ہر کھیت دھول کی تلاس میں رہتا ہے۔ کرسیوں۔ میجوں پر انگلیاں رگڑے ہے۔ اس کے کپڑے دھوتی ہوں۔ اور بچار کرتی ہوں اور......"

وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

میں نے پوچھا۔ "اور کیا؟"

"ارے تو کیا جانے! تو ابھی بچّہ ہے۔ جب سارا گھر سنبھالنا پڑتا ہے تو تُو کیا جانے کیا کیا کرنا پڑتا ہے ایک استری کو۔ تو تو بس بیراگیری کرنا جانے ہے!"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلی اب۔ سُنا تھا تو نیا نیا آیا ہے۔ تجھُ سے ملنے آگئی۔"

اور وہ دھڑ دھڑ کرتی۔ مٹکتی کوارٹر سے باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد رمدھو آن دھمکا اور لگا مجھے گلبیا پر لکچر پلانے۔

میں نے اس سے کہا۔ "تو نے مجھے کیا بچّہ سمجھ رکھا ہے! گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے میں نے! ایسی تو نہ جانے کتنی چھوکریوں سے نمٹ چکا ہوں۔ میں کیا خبردار ہوں اس سے۔ اس سے کہہ دے جا کر وہ مجھ سے خبردار رہے۔"

رمدھو بولا..... "نمٹنے کی بات مت کرو بھیّا! نمٹ تو اس سے سب چکے ہیں۔"

"ایسا؟"

"سچ بولوں ہوں بھیا! شاید ہی کوئی بچا ہو اپنی بستی میں۔"

"تو بھی نہیں؟" میں نے اس کی سوکھی ٹانگوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا جو آدھی ننگی تھیں۔

وہ سینہ پھلا کر بولا۔" اور نہیں تو کیا! کہہ جو دیا ایک بھی نہیں بچا۔"

"پھر اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے؟"

جواب میں وہ کچھ آئیں بائیں شائیں بک کر چلتا بنا۔

اس کے بعد میں نے دو تین مرتبہ گلبیا کو نوکروں کی بستی میں دیکھا۔ دندناتی آتی اور دندناتی چلی جاتی۔ کبھی کسی سے مذاق کیا۔ کبھی کسی کو چھیڑا۔ کسی کے بچّے کو گود میں اٹھا لیا۔ کسی کا منہ چڑا دیا۔ کسی کی طرف زبان نکال دی۔ مگر میں نے ایک بات نوٹ کی کہ نوکروں کی بیویاں اس سے بالکل نہ کتراتیں۔ لنڈورے نوکر ان کی موجودگی میں کھل کھیلنے سے باز رہتے۔ کوئی من چلا آنکھ بچا کر اس کے چٹکی بھر لیتا تو اسے ایسے گھورتی جیسے نگل جائے گی۔ یا تھوک دیتی اس پر۔ یا اسے ایک موٹی سی گالی دے دیتی۔ یا اسے کوستی۔ اور گلزاری کو تو میں نے تھپڑ کھاتے بھی دیکھا۔

ایک دن میں سائیکل پر بڑے صاحب کے لئے اسکاچ وہسکی کی بوتل لے کر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں گلبیا نظر آگئی۔

میں نے سائیکل روک کر پوچھا۔" کہاں جا رہی ہو گلابو؟"

"بنگلے۔"

"چل میں تجھے چھوڑ دوں۔"

وہ اچک کر کیریر پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔" سامنے آجا ڈنڈے پر۔"

وہ ذرا جھجکی۔ پھر آکر ڈنڈے پر بیٹھ گئی۔ اور بولی "لے تو بھی کیا یاد کرے گا۔ پر دیکھ سائیکل ٹھیک سے چلائیو۔ ورنہ گرا دوں گی۔ اس حرامی کے پلّے گلّو اری نے بھی ایک دن مجھے سائیکل پر بٹھایا تھا۔ یہیں سامنے۔ پر جب سائیکل چلانے لگا تو نہ جانے کیسے چلا رہا تھا کہ سالے گھٹنے بر وریر میرے لگے جا رہے تھے۔ میں کود پڑی سالے کی سائیکل سے۔"

میں ہنسنے لگا۔

"تو فکر مت کر۔ سمجھ لے اُڑن کھٹولے پر بیٹھی ہوئی ہے۔"

اس کے ہاتھ میں ترکاری کا جھولا تھا۔

میں نے پوچھا... "بازار کرنے گئی تھی؟"

وہ "ہوں" کر کے چپ ہو گئی۔

"تیرا پروفیسر......"

"پروفیسر نہیں۔ پروبھ۔ تجھے پہلے بھی ٹونک چکی ہوں۔"

"اچھا بابا۔ پروبھ۔ تو تیرا پروبھ کوئی اور نوکر کیوں نہیں رکھتا۔ سودا سلف لانے کے لئے۔ جھاڑ پونچھ کرنے کے لئے۔"

"کیوں رکھے دوسرا نوکر!" اس نے جھلا کر کہا۔

"تجھے سارا کام جو کرنا پڑتا ہے۔"

"میں کوئی گھبراتی ہوں سارا کام کرنے سے۔"

"تیرا پروبھ کنجوس مالوم پڑتا ہے۔"

"تو کیا جانے! یہ کنجوس نہیں۔"

"تو پھر دوسرا نوکر کیوں نہیں رکھ لیتا؟"

"کیوں رکھے دوسرا نوکر! اور دیکھے تو رکھ کر! میں رکھنے دوں گی اسے!"

"کیوں ؟"

"یہ بھول پیسے خراب کرے گا۔ اتا کام تھوڑی ہے کہ دو نوکر رکھے۔"

"تُو تو خلاف ہے دوسرے نوکر کے۔"

"میں بھی کھلا بچھ ہوں اور ...."

اور تیرا پردہ بھی ؟"

"اس نے کبھی اس کی بات ہی نہیں کی۔ اس نے تو سارا گھر مجھ پہ چھوڑ رکھا ہے۔ اور مجھے دوسرے کی جرورت نہیں مالوم پڑتی۔"

"تو تُو گھر کی مالکن ہے!"

"اور نہیں تو کیا!"

"اور تجھے اپنے پردہ کا بڑا خیال ہے؟"

"یہ ہو رکھتا ہے میرا کھیال۔"

اتنے میں پروفیسر صاحب کا بنگلہ آگیا۔ میں نے سائیکل روک دی اور وہ کُود کر یہ جا وہ جا۔

ایک دن گلزاری نے مجھے بتایا کہ گلبیا پروفیسر صاحب کے پاس اس وقت سے ہے جب وہ چھ سات برس کی تھی۔ اب اس کی عمر کوئی اٹھارہ انیس برس کی ہوگی۔ یا اس سے کچھ اوپر۔ اس کے مانی یہ ہوئے کہ وہ پروفیسر صاحب کے پاس گیارہ یا بارہ سال سے ہے۔ گلزاری نے بتایا کہ پروفیسر صاحب کو وہ کہیں کھوئی ہوئی مل گئی تھی یا وہ اسے کسی یتیم خانے سے لے آئے تھے۔ یا کچھ اور ہوا تھا۔ یہ ساری بستی میں کسی کو ٹھیک سے نہیں مالوم تھا کہ وہ پروفیسر صاحب کے پاس کیسے پہنچی۔ پر یہ سب کو پتا تھا کہ پروفیسر صاحب نے اُسے بڑے خیال سے پالا۔ اور ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح۔

لیکن رمدھو اور کٹو اور نوکروں کا خیال تھا کہ پروفیسر صاحب نے گلبیا کو بیٹی کی

طرح پالا ہو یہ ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن اب وہ اُسے بیٹی کی طرح نہیں رکھتے ہیں۔

میں نے رمدھو سے پوچھا۔ "پروفیسر میں اب بھی اتنا دم ہے کیا؟"

کہنے لگا۔ "بھیا۔ اُس کے سپھید بالوں پر مت جاؤ۔ بڈّھے کی کاٹھی اچھی ہے۔ پُرانے جمانے کا جو ہے نا۔"

ایک دن میں اپنے بنگلے کے بغیچے میں بیٹھا ہوا تھا کہ "رمجاتی" کی آواز آئی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ گلبیا اپنے بنگلے اور میرے بنگلے کے بیچ کی دیوار پر بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔

"مکھیاں مار رہا ہے؟"

میں مکھیاں تو نہیں مار رہا تھا۔ مگر کچھ کر بھی نہیں رہا تھا۔

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جرا ادھر آ۔"

"کیوں؟"

"آتو!"

میں اُٹھ کر چلا تو اس نے پھر آواز دی۔ "اِدھر ہی سے آجا۔ دیوار پھلانگ کر۔"

میں نے کہا "میں کوئی چور اُچکا ہوں جو دیواریں پھاندتا پھروں!"

"تیری مرجی" کہہ کر وہ دیوار پر سے کود پڑی۔ اور میں اپنے بنگلے کے پھاٹک سے نکل کر اُس کے بنگلے کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"آ تجھے اپنا بنگلہ دکھاؤں۔"

میں اُس کے ساتھ ہو لیا۔ اور وہ مجھے چار کمروں کے اس بنگلے میں گھماتی پھری۔

ڈرائنگ روم دکھایا۔ ڈیننگ روم دکھایا۔ پروفیسر صاحب کے سونے کے کمرے میں لے گئی۔ اور اس کمرے میں لے گئی جہاں بڑی بڑی الماریوں میں بہت سی کتابیں ٹھسا ٹھس بھری ہوئی تھیں۔ ہر کمرے میں ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ دھول کا کہیں نام تک نہیں تھا۔ گلدانوں میں پھول تھے، کارنس پر پیتل کی چیزیں چم چم کر رہی تھیں۔

وہ اندر والے برانڈے میں رک گئی اور میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگی: "کیسا ہے میرا گھر؟"

"بہت اچھا۔ پر یہ گھر تیرا تھوڑی ہے۔"

"ارے۔ اس سے کیا پھرک پڑتا ہے۔ ایک ہی بات ہے۔ تو تو یہ بتا کہ کیسا رکھتی ہوں گھر کو۔"

"بہت اچھا۔ اگر یہ گھر تو چلاتی ہے تو تیری داد دینا پڑے گی۔"

وہ خوش ہو کر ہنسنے لگی۔

"اچھا۔ اب تو جا۔ پربھو کے آنے کا سمے ہو رہا ہے۔"

"ڈرتی ہے؟"

"نہیں تو۔ پر پربھو نے تجھے گھر میں دیکھ لیا تو بگڑے گا۔"

"کیوں؟"

"اسے بنگلے میں اس کے پیچھے کسی کا آنا اچھا نہیں لگتا۔"

میں چلنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک خیال آیا۔

"اور تو کہاں رہتی ہے؟"

"ہائے تجھے اپنا کمرہ دکھانا تو بھول ہی گئی!"

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ یہ اسٹور روم تھا۔ باورچی خانے کی بغل میں۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی۔ دیوار میں لگے ہوئے لکڑی کے تختے پر ناریل

کے تیل کی ایک بوتل۔ ایک چھوٹا سا آئینہ۔ دو ایک شیشیاں۔ ایک کنگھی اور ایک کنگھا رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک ٹین کا ٹرنک رکھا ہوا تھا۔ جس میں شاید اس کے کپڑے ہوں گے۔ ایک دوسرے کونے میں دو تین سینڈلیں اور چپلیں پڑی ہوئی تھیں۔ کھاٹ پر بچھا ہوا بستر معمولی تھا۔ مگر صاف ستھرا۔ سارا کمرہ اور اس کی تمام چیزیں معمولی تھیں۔ مگر صاف ستھری۔

میں نے کہا "یہ ہے تیرا کمرہ!"

وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ "چاہوں تو بڑے کسی بھی کمرے میں رہنے لگوں پر مجھے کچھ پسند نہیں۔"

"کیوں پسند نہیں؟"

"مجھے یہیں اچھا لگتا ہے۔ اور پربھو کو بھی یہی بات پسند ہے کہ میں جیسی ہوں ویسی رہوں۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا بھلا؟"

"مطلب یہ ہوا کہ منش کو ویسے ہی رہنا۔ چاہئے جیسا اسے بھگوان نے بنایا۔"

"یہ کیا بات ہوئی! بھگوان نے منش کو ننگا بنایا تو وہ ننگا ہی رہے؟"

"اب میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔ دیکھ بات یوں ہے۔ تو میرے یہ کپڑے دیکھ رہا ہے یہ سب کے سب معمولی ہیں۔ اور۔۔۔۔۔" اس نے ٹرنک کھول کر اس میں سے کئی کپڑے نکال کر مجھے دکھائے۔ "اور یہ کپڑے بھی سب معمولی ہیں۔ میں چاہوں تو اچھے اچھے ریشمی کپڑے پہنوں۔ پربھو کچھ نہیں کہے گا۔ پر وہ کہتا ہے۔ گلبیا تو جیسی ہے ویسی رہ۔ تیری سندرتا اسی میں ہے کہ تو کسی کی نقل نہ کرے۔ اب میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔ وہ بڑی بڑی باتیں کرتا ہے۔ بڑی نرالی باتیں۔ جو میری سمجھ میں تو کیا تیری سمجھ میں بھی نہیں۔ کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آنے کی۔ ایک دن میں ایک ساڑھی خرید لائی۔ اور

پہن کر اُسے دکھائی۔ اتی اچھی تھی بہہ ساڑھی۔ پر پر وبھ کو بھلی نہیں لگی۔ کہنے لگا، گلبیا تجھ پہ اتنا جیسا سجتا ہے ویسی کوئی چیز نہیں سجتی۔ تو جیسی ہے ویسی رہ۔ تبھی تو بہہ کہتا ہے میں اس کمرے میں رہوں۔ اور اس کھاٹ پہ سوؤں۔ ویسے گھر میں ایک اور پلنگ بھی ہے۔ اس پہ جور سے لیٹو تو اُچھلتا ہے۔ پر بہہ کہتا ہے تو ان کمروں میں رہے گی اور ایسے پلنگ پر سوئے گی تو تُو بدل جائے گی۔ اور تو بدل جائے گی تو تیری سندرتا بدل جائے گی۔۔۔۔۔ اب میں تجھے کیسے بتاؤں بہہ کیسی کیسی باتیں کرتا ہے۔ میری سمجھ میں کھود نہیں آتیں۔ اس کی باتیں تو تجھے کیسے سمجھاؤں۔ پڑھی لکھی ہوتی تو۔۔۔۔۔۔"

"اس نے تجھے پڑھایا لکھایا کیوں نہیں؟"

"بہی گلبیا تو بدل جائے گی بالی بات۔ تو تُو جنگل کا پھول ہے۔ ہرنی ہے۔۔۔۔"

مجھے رمدھو کی بات یاد آگئی۔

"پر لوگ تو کہتے ہیں کہ وہ تجھے بالکل بیٹی کی طرح رکھتا ہے۔"

"بیٹی کی طریوں۔۔۔" اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "بہہ کیا رکھے گا بیٹی کی طریوں! اس کی ماں۔"

میں نے ہمت کر کے کہا "کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ تجھے۔۔۔۔۔"

اس نے مجھے جملہ ختم نہ کرنے دیا اور مجھے کمرے سے باہر دھکیلتے ہوئے بولی۔

"تو اب جا۔ بہت کر لیں تو نے باتیں۔ جا۔ بھاگ اب۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔"

میں ایک ہفتے تک بڑے صاحب کے ساتھ دورے پر رہا۔ واپس آیا تو گلزاری نے بتایا کہ گلبیا نے دو ایک دفعہ میرے بارے میں دریافت کیا کہ "رمجانی کو کیا ہو گیا یا کہیں ڈوب مرا جا کر۔"

پھر ایک دن وہ آپ ہی آپ میرے کوارٹر میں گھس آئی۔

"تو کہاں مر گیا تھا جا کر؟"

"کیوں؟ کیا میری یاد آتی تھی تجھے؟" میں نے اُسے چھیڑا۔

"میری جوتی کو آئے تیری یاد! میں تو یوں ہی پوچھ رہی تھی یہ

"دورے پر گیا تھا۔"

وہ کھاٹ پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلانے لگی۔ اور "جیا بیکرار ہے. تیرا انتجار ہے" گنگنانے لگی۔

میں نے پوچھا "تو سینما دیکھتی ہے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بڈھا جو نہیں دیکھتا۔"

"تو کیا ہوا؟"

"باہ۔ کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں اکیلی تو جانے سے رہی۔ کسی اور سنگ وہ مجھے جانے نہیں دے گا۔ اسے سینما پسند بھی نہیں۔ میں نے ایک دِچھ کہا بھی تو بولا کر سینما بُری چیج ہوتی ہے۔ بُہہ تو ہر بکھت اتی اتی موٹی پستکیں پڑھا کرتا ہے۔ اور رات کو بگیچے میں ٹہلتا ہے۔"

"اور اس کے بعد؟"

اس نے مجھے گھورا۔

"اس کے باد کیا۔ سوجاتا ہے پڑ کے۔"

میں نے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔

"دیکھ گلبیا میں نے بہت زمانہ دیکھا ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، تو مجھے نہیں چلا سکتی۔"

وہ مجھے گھورتی رہی۔

"مجھے سب مالوم ہے کہ وہ تیرے ساتھ کیا کرتا ہے۔"

اس نے پھنکار ماری۔

"کیا کرتا ہے میرے سات؟"

وہ تجھے سلاتا ہے اپنے سات۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے یہ بات کہی تھی اور سوچ رہا تھا کہ جواب میں وہ مجھ پر جھپٹ پڑے گی یا کم از کم مجھے ایک گالی ضرور سنائے گی۔ مگر اس نے نہ تو گالی دی اور نہ جھپٹی میرے اوپر۔

"تجھے کیسے مالوم؟"

جتنا تعجب مجھے اس کے گالی نہ دینے اور نہ جھپٹنے پر ہوا تھا۔ اس سے زیادہ اس کے سوال پر ہوا۔ اور بڑی سادگی تھی اس کے سوال میں جیسے اس نے بڑی ماصومیت سے کیا تھا۔

وہ ذرا دیر چپ رہی۔ اس کی ٹانگیں زور زور سے ہلتی رہیں۔ پھر اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "تجھے ایک بات کہوں رنجانی ؟"

"بول"

"تو سوگند کھا کہ کسی سے کہے گا نہیں"

"تیرے سر کی سوگند۔"

"سوگند بھی کھائی تو میرے سر کی۔ اپنے سر کی سوگند کیوں نہیں کھاتا ؟"

"میرے سر کی سوگند"

وہ پھر چپ ہو گئی اور ٹانگیں ہلاتی رہی۔

میں آکر اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"بول نا۔ کیا کہہ رہی تھی؟"

اس نے رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔ "تو جو یہ سوچنے کی بات کر رہا تھا، ابھی تو یہ سچ ہے۔ پر تجھے ایک بات نہیں معلوم۔ وہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔"

"وہ کیا ہے؟"

"بس یہ کہ میں اس بڈھے کی جورو نہیں۔"

میں ہنسنے لگا۔

"یہ تو سب کو معلوم ہے۔"

وہ جھلا گئی۔

"تو بڑا بدھی مان بنتا ہے پر اتی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اوپرے ہی کرتا ہے۔"

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے۔ تو اس کی بیوی نہیں ہے۔ یہ مجھے بھی معلوم ہے۔ تجھے بھی اور سب کو بھی۔"

"وہی تو نہیں معلوم تجھے۔ اور کسی کو سوائے میرے۔ دیکھ بات یوں ہے کہ بڈھا مجھے سلاتا تو ہے اپنے پاس پر میں اس کی جورو نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر شرما گئی۔ اور پھر بولی "اب تو سمجھ گیا تو؟"

میں سمجھ تو گیا پر بڑا حیران ہوا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"یہی تو بات ہے۔ یہ میں خود سوچتی ہوں۔"

میں کھسک کر اس کے قریب آ گیا۔

"تو نے کبھی بات کی اس سے اس بارے میں؟"

"بڑا بے شرم ہے تو۔ کوئی ایسی بات بھی کرتا ہے۔ جیسے میں نے ایک دن اُسے

مارا جرور۔"

میں چونک پڑا۔

"مارا؟"

"تیرے سر کی سوگند۔ اپنی بکباس کر رہا تھا۔ بہی سُندرتا۔ جنگلی بھول بالی بکباس۔
میں تیری سندرتا کھراب نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے تجھ سے اور کوئی گرج نہیں بس اتی گرج
ہے تو میرے پاس رہے۔ تو میرے پاس ہوتی ہے تو میری آتما جگمگانے لگتی ہے
میرے سر میں بجلی چمکنے لگتی ہے۔ اور پھر یہ بجلی میرے دماگ میں جاتی ہے۔ اور یہاں
سے آتما میں۔ اور پھر نئے نئے سنسار میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔ اور پھر
میں بڑی بڑی چیجیں لکھتا ہوں۔ کچھ اس کسم کی بکباس کیے جا رہا تھا۔ جسے میں ہجار بار
سُن چکی ہوں۔ میں نے بھلا کہ اس کی دودھیا کھوپڑی پہ ایک چیت جما دی ——
کس کے۔"

وہ ہنسنے لگی ۔

"اس نے کچھ نہیں کہا؟"

"کہتا کیا۔ میں کیا ڈرتی ہوں اس سے۔ میرے بنا تو بُہہ جندہ نہیں رہ سکتا۔ کہتا ہے۔
گلبیا تیری بگیر میں بہہ جو بڑی بڑی پُستکیں لکھ رہا ہوں سب ادھوری رہ جائیں گی۔"

"تب تو رمدھو سچ کہتا تھا!"

"کیا کہتا تھا رمدھو؟"

"یہی کہ تو بڈھے کو انگلی پہ نچاتی ہے۔"

"یہ بات نہیں رمجانی۔ میں اُسے پریسان تھوڑی کرتی ہوں۔ بہہ جو بھی کہتا ہے میں
کرتی ہوں۔ پر بہہ مجھے بہت پریسان کرتا ہے۔ اتے سال ہو گئے پر میری سمجھ میں
یہ بڈھا آج تک نہیں آیا۔ نہ جانے کیا چاہتا ہے مجھ سے۔ اور یہ کو نتاؤں بالی باتیں جو

کرتا ہے" ان سے میں اور بھی پریشان ہو جاتی ہوں۔ میرے پلّے کھاک نہیں پڑتا۔ مُبہ کیا بک رہا ہے۔"

میں کھسک کر اس کے بالکل قریب آ گیا۔

"تو کیوں بیکار اپنا جی جلاتی ہے۔ میں جو موجود ہوں۔"

اس نے مجھے گھورا۔

"تیرا مطلب؟"

میں نے اس کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تجھے بیوی بننے کی جو فکر ہے تا سو میں حاضر ہوں۔"

اس نے جھپاک سے اُٹھ کر ایک زور کا تھپیڑ میرے منہ پہ مارا۔ میرا ہاتھ ہٹایا۔ مجھے حرامی کا بچّہ کہا اور یہ جا وہ جا۔

اس کے جاتے ہی رمدھو جو شاید تاک میں تھا آن دھمکا۔

"آج تو بڑی دیر بیٹھی؟"

میں نے سُنی ان سُنی کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ گلبیا جو ہے نا۔ تو تو اس سے نمٹ چکا ہے۔ ہے نا؟"

"تمھارے سر کی کسم بھیّا!"

میں نے چھوٹتے ہی اُسے دو تین موٹی موٹی گالیاں دیں اور کوٹھے سے باہر نکال دیا۔

اس کے بعد گلبیا لمبا غوطہ کھا گئی۔ کئی دن تک نظر نہ آئی۔ ایک دن میں بازار جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"رمجانی۔ او رمجانی!"

گلبیا کی آواز تھی۔ سالی کا جسم ایسا کہ نظریں جم جائیں اور آواز ایسی کہ پیر گڑ جائیں۔ میں رُک گیا۔ میرے پاس آ کر بولی۔ "کدھر جا رہا ہے؟"

میں نے کہا "بازار۔"

کہنے لگی۔ "چل میں بھی چلتی ہوں۔ بڈھے کے لئے دارو لانی ہے۔"

"بڈھا کیا پیتا بھی ہے؟"

"تو تو نرا گدھا ہے۔ سراب نہیں دارو۔ دارو سمجھتا ہے؟ دبائی سمجھا؟"

"اچھا۔ دوائی۔ کیا ہوگیا ہے تیرے بڈھے کو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ مالس کی دبائی ہے۔ بڈھے کو مالس کرانے کا بڑا سوک ہے؟"

تھوڑی دور چل کر میں نے کہا۔ "بہت دنوں بعد دکھائی دی تو!"

"میں بتاؤں کیوں نہیں دکھی؟"

"بتا۔"

"تو بھی تو بدمالس ہے گلُجاری، مدھو اور مراری کی ماپھک۔ میں سمجھی تھی تو اچھا آدمی ہوگا پر تو بھی گندا نکلا۔"

میں گلبیا کا اشارہ سمجھ گیا۔

"دیکھ گلبیا۔ بات یوں ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں تجھے کچھ اور سمجھ بیٹھا۔ اب ایسی بات نہیں ہوگی۔"

"کھا میرے سر کی سوگند۔"

"تیرے سر کی سوگند؟"

"ہاں میرے سر کی سوگند۔"

میں نے اس کے سر کی سوگند کھائی۔

"جا تجھے ماپھ کر دیا۔ پر پھر نہ کریو ایسی گلطی نہیں تو کھون پی جاؤں گی تیرا!"

میں ہنسنے لگا۔

دوسرے دن وہ میرے کوارٹر میں آدھمکی۔

"بڑا عجب ہو گیا رجانی!"

"کیا قیامت آ گئی؟"

"میرے بڈھے نے تجھے دیکھ لیا۔ میرے سات۔"

"کب؟"

"کل جب تو اور میں بجار جا رہے تھے۔"

"تو کیا ہوا!"

تو کیا جانے کیا ہوا۔ بڑا ناراج تھا،

"یہ میں کہتا ہوں اس میں ہوا ہی کیا اگر تو میرے ساتھ تھی اور اس نے ہمیں دیکھ لیا۔"

"تیرے بھیجے میں نہیں آنے کی یہ بات۔ اُسے جرا بھی پسند نہیں میرا کسی سے ملنا اور وہ بھی سرونٹ کوارٹر والوں سے۔ بُہہ کہتا ہے یہ لوگ تجھے کھراب کر دیں گے گلبیا۔"

"ایسی بات!"

"اور پوچھ رہا تھا کون تھا بُہہ آدمی تیرے سات؟"

"تو نے بتا دیا؟"

"اور نہیں تو کیا۔ میں نے کہہ دیا رجانی تھا۔ اور تجھے مالوم ہے۔ میں نے تھوڑی سی تیری تاریپھ بھی کر دی۔ میں نے کہا رجانی با کی نوکروں سمان نہیں۔"

"تیری مرمت نہیں کی اُس نے!"

"مرمت! اُس کی ماں کی ...... ۔ اُس کی مجال جو چھو بھی دے مجھے!"

وہ تھوڑی دیر اور بیٹھی رہی۔ ٹانگیں ہلاتی رہی۔ گنگناتی رہی اور پھر کولھے مٹکاتی اور پائل چھنکاتی چلی گئی۔

رات کا وقت تھا۔ کوئی گیارہ بارہ بجے ہوں گے۔ کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔

میں نے پوچھا "کون ہے؟"
باہر سے گلبیا کی گھٹی ہوئی آواز آئی۔ "میں ہوں گلبیا۔"
میں لحاف پھینک کر اُچھلا۔ دروازہ کھولا تو گلبیا سامنے کھڑی تھی۔ غڑاپ سے کوارٹر میں آگئی۔
"دروجا بند کر کے کُنڈی چڑھا دے۔"
میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔
وہ کمرے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔ "تو آگئی گلبیا؟"
"ہاں۔ میں آگئی رمجانی!"
میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے بدن میں ہلکی سی کپکپی تھی۔
"روشنی کر دوں؟"
"نہیں۔ نہیں۔ بتی مت جلئیو۔"
میں نے ہاتھ کندھے پر سے ہٹا کر اس کی کمر پر رکھ دیا۔
"چل۔ کھاٹ پر بیٹھ چل کے۔"
وہ آ کر کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ اور میں بھی۔
"تجھے جاڑا لگ رہا ہے۔ آلیٹ جا۔"
"مجھے جاڑا باڑا کچھ نہیں لگ رہا۔"
مگر وہ چپکے سے لیٹ گئی اور میں بھی۔
وہ بولی "مالوم ہے میں کیوں آئی ہوں تیرے پاس اس سمے؟"
میں چُپ رہا۔

"میں اس بڈھے سے لڑ آئی۔ اور اب اس کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی چاہے کچھ ہو جائے۔ پر میں اس کے پاس اب ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

میں نے اس کی بات میں دکھاوے کے لئے انٹرسٹ لیتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"اب کبھی نہیں جاؤں گی اس کے پاس۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"بھئی جورو والی بات اور کیا ہوتا!"

میں چپ ہو گیا۔ اور وہ بھی۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ ہنس ہنس کر بتا رہی تھی کہ وہ کیوں اور کیسے پروفیسر صاحب سے لڑی۔ کیسے جھلا کر اس کے پلنگ پر سے اُچھل کر دندناتی ہوئی اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کیسے وہ اس کی خوشامدیں کرتا رہا اور کیسے وہ ان خوشامدوں کی پرواہ کئے بغیر سیدھی میرے کوارٹر پہنچی۔

یکایک وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی ہنسی رُک گئی۔ وہ پانچ چھ منٹ خاموش پڑی رہی۔ پھر اس کے بدن کو حرکت ہوئی۔ اس نے لحاف اُلٹ دیا اور کھڑی ہو کر اپنے کپڑے ٹھیک کرنے لگی۔

وہ دروازے کی طرف بڑھی تو میں نے پوچھا: "کیا جا رہی ہو کلابو؟"

اس نے "ہاں" کی

میں نے پوچھا "کہاں؟"

کہنے لگی "اپنے بڈھے کے پاس۔ اور کہاں۔ میرے بنا ٹھٹھر کر جائے گا بیچارا!"

پھر اس نے کنڈی کھول کر آہستہ سے کہا۔ "دروازہ بند کر لے۔ میں چلی۔"

شوبھارانی

نئی دہلی۔ ۱۹۵۵ء

شعور۔ کراچی

جونہی میں گھر میں داخل ہوا شوبھارانی آن دھمکیں۔ میں تھکا ہوا تھا۔ صوفے پر لیٹ گیا۔ وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئیں اور لگیں پیار کرنے۔ مگر میں نے زیادہ التفات نہ کیا تو پوچھنے لگیں۔

"انکل۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تو پھر تم مجھے پیار کوں نئیں کرتے؟"

یہ "کوں" شوبھارانی کا ٹریڈ مارک ہے۔ استفہام کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے موقعے ہوتے ہیں جب وہ اپنا مفہوم بغیر اس "کوں" کے ادا نہیں کر سکتیں۔ میں نے انہیں اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اور لگاتار کئی پیار کر ڈالے۔ وہ خوش ہو گئیں اور لگیں مسکرانے۔ حسبِ عادت انہوں نے میری گردن میں بانہیں ڈال کر جھولا جھولنا شروع کر دیا۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنا منہ جسے میں تھوتھنی کہا کرتا ہوں میرے ہونٹوں کے سامنے کرنے لگیں، چار و ناچار مجھے ہر بار ان کی تھوتھنی کو چومنا پڑا۔

شوبھارانی نے اچانک پوچھا۔ "آنٹی کاں گئی؟"

"ہسپتال ——"

"کوں گئی ہسپتال۔؟"

"ان کی طبیعت خراب ہے۔"

میں اپنی بیوی کو ہسپتال میں داخل کر کے واپس آیا تھا۔

"کوں خراب ہے اس کی طبیعت؟"

ان کا مطلب تھا۔ کیا خراب ہے اس کی طبیعت۔؟

"بس ہے خراب۔"

"بس ہے خراب"۔ انہوں نے میری نقل کی۔

"میں پوچھتی ہوں کوں ہے خراب۔؟"

"تمہارے بتانے کی بات نہیں۔"

"کوں نئیں۔؟"

میں پریشان تھا۔ بگڑ گیا۔

"جاؤ۔ بھاگو یہاں سے۔ اور میرا دماغ مت کھاؤ۔"

وہ میرے تیور پہچان گئیں اور اپنے سوالوں کی بوچھاڑ بند کر کے انہوں نے پھر اپنی ٹھوتھنی میرے منہ کے سامنے کر دی۔ مگر میں نے پیار نہیں کیا۔

"تم ناراج ہو گئے۔ انکل۔؟"

میں چپ رہا۔

"آئیں۔؟"

مجھے بولنا ہی پڑا۔ "نہیں۔"

"تو پار کوں نئیں کرتے۔"

میں نے جھک کر پیار کیا۔ وہ میری گود میں دراز تھیں۔

میرے پیار نے پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا دی۔ اور وہ گنگنا گنگنا کر میرے بالوں کو بگاڑنے اور سنبھالنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد میں نے انہیں اٹھا کر صوفے پر پٹک دیا۔

"تم کھیلو۔ میں کپڑے بدلوں گا۔"

"اور نہاؤ گے نہیں۔؟"

شوبھا رانی کو میرے اوقات کا کلی علم ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ میں کب دفتر جاتا ہوں۔ کب کھیلنے جاتا ہوں۔ کب کھیل کر لوٹتا ہوں۔ کتنی دیر آرام کر کے نہاتا ہوں۔ کب کھانا کھاتا ہوں۔ کب سوتا ہوں۔ اور کب سو کر اُٹھتا ہوں۔

میں نے کہا۔ "ہاں۔ نہاؤں گا بھی۔ مگر پہلے کپڑے بدلوں گا۔"

وہ "اچھا" کہہ کر صوفے پر اوندھی ہو گئیں اور کشن پر کڑھے ہوئے منظر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

میں نہا دھو اور کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو شوبھا رانی بدستور موجود تھیں۔

"آپ ابھی تک موجود ہیں۔"

"جی۔" انہوں نے اخروٹ کے ہاتھی کو ریڈیو پر واپس رکھتے ہوئے کہا۔

میں سگریٹ سلگا کر ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا اور وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد انہوں نے اچانک سوال کیا۔

"آئیں انکل۔ آنٹی کب واپس آئیں گی۔؟"

"کچھ دن بعد۔"

"کتنے دن باد۔؟"

"دو تین دن بعد۔"

"اچھا۔"

وہ پھر چپ ہو گئیں اور زور زور سے ٹانگیں ہلانے لگیں۔

ان کی خاموشی پھر اچانک ٹوٹی۔

"انکل"

"کیا ہے۔؟"

"آنٹی کوں گئی اسپتال؟"

"بیمار ہے۔"

"کوں بیمار ہے۔؟"

"پھر وہی بکواس!"

"میرے اچھے انکل۔" اور وہ آ کر مجھ سے چمٹ گئیں۔

"تم نے آنٹی کو مارا۔؟"

میں ہنسنے لگا۔

"پاگل ہو گئی ہو"

"نئیں انکل۔ بتاؤ تم نے مارا آنٹی کو۔؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں۔"

"تبھی" وہ کھڑی ہو کر اچھلنے لگیں اور اچھل اچھل کر تالیاں بجانے لگیں۔

"تبھی کیا۔؟"

"تبھی اس کے اتا بوت سا کھون نکلا۔"

"تجھ سے کس نے کہا اس کے خون نکلا۔؟"

"مجھے مالوم ہے۔"

تم نے اسے مارا اچھ۔" انہوں نے تالیاں بجا کر کہا۔

"تو کیا ہوا۔؟"

"مارا تو خون ضرور نکلا ہو گا۔"

"کیا کہنے تیری عقل کے!"

"مجھے سب مالوم ہے۔ تم اُسے روج مارتے ہو۔"

"گدھی کہیں کی۔ کوئی مارتا ہے اپنی بیوی کو۔"

"تمی تو کہہ رہے تھے تم نے مارا۔"

"وہ تو میں مذاق میں کہہ رہا تھا۔"

"میں سب جانتی ہوں۔ تم اُسے روج مارتے ہو۔ اور اچھا کرتے ہو۔"

"کیا اچھا کرتا ہوں۔؟"

"جو اُسے مارتے ہو۔"

"اچھا آنے دے اسے ہسپتال سے واپس وہ خبر لے گی تیری کہ۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

"نئیں میرے اچھے انکل۔ آنٹی سے مت کہنا۔"

میں نے وعدہ کر لیا تو اُن کی سنجیدگی رفو چکر ہو گئی۔ اور وہ پھر اودھم مچانے لگیں۔ اور کمرے کی چیزوں کو اِدھر سے اُدھر کرنے لگیں۔

میں نے ڈانٹا تو آ کر میرے سامنے قالین پر بیٹھ گئیں۔ اور میری فرمائش پر مجھے نرسری رہایم (NURSERY RHYME) سنانے لگیں۔ جس کے ختم ہونے پر میں نے ان سے درخواست کی کہ اب وہ اپنی تشریف لے جائیں تو بڑی نوازش ہو گی۔ مگر انہوں نے درخواست رَدّ کر دی۔ اور ازراہ عنایت مجھے دو اور نظمیں سنائیں۔ ہاتھ ہلا ہلا کر اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر۔

آخری نظم ختم ہوئی تو میں نے پوچھا کہ آج ان کا یہاں سے جانے کا ارادہ ہے کہ نہیں۔ جواب ملا کہ ہے مگر کچھ دیر بعد۔ کیونکہ ان کے ڈیڈی اور ممی کہیں تشریف

رہ گئے ہیں اور گھر پر صرف نوکرانی ہے۔

میں آرام کرنا چاہتا تھا۔ مگر شوبھارانی کی موجودگی میں آرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے میں نے پھر ایک رسالے کی ورق گردانی شروع کر دی۔

چند منٹ کے بعد پھر اچانک ان کا ایک سوال میرے کانوں میں پھٹا۔

"آئی انکل۔ آنٹی رات کو بھی اسپتال میں رہے گی۔؟"

میں نے کہا۔ "ہاں"

"تو تم رات کو اکیلے سوگے۔؟"

میں نے پھر کہا۔ "ہاں"

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں۔ پھر بولیں۔

"میں سو جاؤں آکر تمہارے پاس۔؟"

"میرے پاس۔؟"

"ہاں۔ تمہارے پاس۔ آنٹی کے بیڈ پر۔"

"ضرور۔ ضرور۔" میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اتنے میں باہر سے ان کے ڈیڈی کی گاڑی کی آواز آئی اور وہ یہ جا۔ وہ جا۔

رات کو نو بجے تھے۔ میں کھانا کھا کر جلدی سونے کے خیال سے لیٹ چکا۔ مگر نیند نہیں آرہی تھی۔

یکایک کسی نے سونے کے کمرے کا دروازہ کھٹکٹایا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پردہ ذرا سا ہٹا کر جھانکا۔ شوبھارانی شب خوابی کا لباس پہنے کھڑی تھیں۔ میں نے پردہ چھوڑ دیا۔

پھر دستک ہوئی۔ پھر دستک ہوئی۔ اور پھر دستک ہوئی۔ مگر میں نے نہ تو بجلی جلائی۔ نہ جواب دیا۔ اور نہ دروازہ کھولا۔

دستک دھڑ دھڑ میں تبدیل ہو گئی۔ مگر میں نے دروازہ پھر بھی نہیں کھولا۔
پھر شو بھارانی کی روہانسو آواز آئی۔ "درواجا کھولو انکل۔"
میں نے دروازہ پھر بھی نہیں کھولا۔
پھر شو بھارانی کی آیا کی آواز آئی۔ وہ ان سے کہہ رہی تھی کہ وہ گھر واپس چلیں۔ مگر وہ نہ جانے پر مصر تھیں۔ حتیٰ کہ آیا کو انہیں کھینچ کر لے جانا پڑا۔ اور بہت دیر تک میرے کانوں میں ان کے چلا چلا کر رونے کی آواز گونجتی رہی۔ حتیٰ کہ مجھے نیند آ گئی۔

بہتا خون، اُبلتا خون

نئی دہلی ۔ ۱۹۵۳ء

نقوش ۔ لاہور

پیٹ کے بل لیٹا ہوا ہوں مگر پھر بھی خون سپید چادر تک پہنچ گیا۔ چادر پر خون کے دھبے کا دائرہ آہستہ آہستہ پھیل رہا ہے۔ اور ہرے قالین پر تو جیسے خون کی ایک چھوٹی سی جھیل بن گئی ہے۔ بستر اور قالین میں کم از کم ڈیڑھ گز کا فاصلہ ہو گا۔ اس کے باوجود یہاں سے بجلی کے بلب کا عکس خون کی اس چھوٹی سی جھیل میں صاف نظر آ رہا ہے۔ اور نہ معلوم کتنا خون قالین میں جذب ہو چکا ہو گا۔ اگر قالین کو اٹھا کر دیکھا جائے تو فرش پر بھی خون نظر آئے گا......

اس کی پشت پر لگے ہوئے زخم پر پھایا۔ پھاہے پہ روئی اور روئی پر کپڑے کی سپید پٹی تہہ در تہہ لپٹی ہوئی تھی۔ خون زخم سے نکل کر پھاہے، روئی اور کپڑے کی پٹی میں سے رستا ہوا بستر کی چادر پر آ رہا تھا۔

.... صفدر ڈاکٹر کو لے کر کب لوٹے گا۔!

... صدر یہاں سے کم از کم دو میل ہو گا..... صفدر کو سواری ملی یا نہیں؟ بسیں تو بند ہو چکی ہوں گی۔ باہر بالکل سناٹا ہے۔ یہاں رات گئے کوئی اور سواری بہت کم ملتی ہے۔ مگر صدر میں تو ہر وقت سواری مل جاتی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس اپنی کار ہے..... لوٹتے وقت تو دیر نہ ہونی چاہیئے... اور اگر ڈاکٹر گھر پر نہ ہوا...

... مجھے نقاہت محسوس ہو رہی ہے۔ خون کا بہنا بند نہیں ہوا۔ برابر نکل

رہا ہے.....

اس نے کنکھیوں سے چادر کے درمیانی حصّے کی جانب دیکھا۔

.... ورنہ چادر پہ یہ دھبّہ کہاں سے آتا! اگر خون اسی رفتار سے بہتا رہا تو شاید میں ڈاکٹر کے آنے تک بے ہوش ہو جاؤں۔

.... ڈاکٹر ضرور پوچھے گا کہ زخم کیسے لگا مگر صفدر اُسے بتا چکا ہو گا۔ اس نے کوئی نہ کوئی قصّہ گھڑ لیا ہو گا۔ لیکن ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا تو میں بے کم و کاست سارا واقعہ بیان کر دوں گا۔ مجھے کس بات کا ڈر، اس میں میری کیا غلطی تھی۔ اگر کوئی ذمے دار ہے تو صفدر..... نہیں! کوئی بھی ذمے دار نہیں۔ نہ میں۔ نہ صفدر۔ اور نہ شاید وہ.....

اس کے بدن نے ایک ہلکی سی جنبش کی اور اس کے ادندھے چہرے پہ تکلیف کے نقوش ابھر آئے۔ وہ آنکھیں بند کر کے کراہنے لگا۔

.... اُف! جیسے کوئی زخم کا منہ بند کرتا ہے اور پھر چیر دیتا ہے۔ ہر بار جب ٹیس اٹھتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک نیا زخم لگا۔

.... زخم ضرور گہرا ہے، صفدر میری تسلی کی خاطر کہہ رہا ہو گا کہ اوچھا ہے۔ اوچھے زخم سے کہیں اتنا خون بہتا ہے! نہ جانے کتنا خون نکل چکا ہو گا۔ کمزوری بڑھتی جا رہی ہے..... زیادہ خون بہہ جانا خطرناک ہے۔

پرسوں کے اخبار میں ایک خبر تھی۔ اس کے بھی پیٹھ میں زخم لگا تھا۔ ہسپتال لے جانے میں دیر ہوئی تھی۔ خون زیادہ بہہ گیا تھا۔

اخبار میں خبر چھپے گی۔ نذیر۔ اختر۔ تاج سبھی پڑھیں گے۔ لوگ کیا کہیں گے! اور جب گھر والوں کو پتہ چلے گا! کتنی بدنامی ہو گی! بدنامی کی موت! رسوائی کی موت!

.... بدنامی تو بہر صورت ہو گی۔ یہ تو بہر صورت پوچھا جائے گا کہ زخم کیسے

لگا۔ ڈاکٹر کو سارا قصہ سنایا جا سکتا ہے لیکن اور لوگوں سے کیا کہا جائے گا! ان کے سوال کا کیا جواب دیا جائے گا! جھوٹ ؟ کوئی من گھڑت قصہ ؟ مگر صفدر پر تو بہر صورت الزام آئے گا۔ اگر صحیح بات کہہ دی جائے اور لوگ یقین کر لیں کہ میں بے قصور ہوں تب بھی صفدر پر تو الزام آئے گا۔ کم از کم بدنامی تو ہو گی۔

..... بدنامی تو اس کی بھی ہو گی ..... مگر اس کی بدنامی کی مجھے کیا پروا۔ صفدر تو خیر میرا دوست ہے مگر وہ .....

..... مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ہے کون۔ مجھے اس کا نام بھی نہیں معلوم۔ آج سے پہلے میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ نہ شاید صفدر نے کبھی اس کا ذکر کیا۔ یاد تو نہیں پڑتا .....

اس نے آنکھیں کھول دیں اور سامنے تین پاؤں کی ایک چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی گھڑی کو دیکھنے لگا۔

بارہ بجنے میں دس منٹ۔ صفدر کو گئے بیس منٹ ہو گئے۔ وہ گیارہ بجے کے قریب یہاں آیا تھا۔ گھنٹہ بھر ہوتے آیا۔

..... کیا کچھ ہو گیا اس ایک گھنٹے میں! آیا تھا یہ سوچ کر کہ صفدر سے کچھ باتیں ہوں گی۔ فرصت کا وقت ہے۔ آرام سے بیٹھ کر گفتگو کریں گے۔ کافی کا دور چلے گا۔ مگر صفدر سے بات ہوئی تو کیا۔ کیا کہا تھا اس نے جانے سے پہلے؟ ...
"میں ابھی آیا ڈاکٹر کو لے کر ..... تم اسی طرح لیٹے رہنا۔ کروٹ نہ بدلنا ....."

..... کتنا گھبرایا ہوا تھا وہ۔ جا رہا تھا دروازے کی طرف اور دیکھ رہا تھا میری طرف۔ اس کا سر کتنی زور سے دروازے سے ٹکرایا تھا۔

..... وہ بھی تو اسی دروازے سے باہر گئی تھی۔ مگر اس کے جانے اور صفدر کے جانے میں کتنا فرق تھا۔ اس نے تو ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ تیر کی طرح گئی۔

۔۔۔۔۔ آخر میری کیا خطا تھی۔ میں نے کیا غلطی کی تھی۔ میں نے نہ کچھ کہا اور نہ کچھ کیا۔ شاید اُسے مجھ سے ڈر لگا ہو۔ مگر میں تو اُسے جانتا بھی نہیں۔ شکل وصورت سے تو کسی بھلے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے یا شاید مجھے دھوکہ ہوا ہو۔۔۔۔

امجد علی کی بیوی تو نہیں تھی ؟ صفدر نے ذکر تو کیا تھا۔ نام نہیں بتایا تھا مگر کہا تھا "۔۔۔۔۔ اب کی سے ایسی ہنڈیا پکائی ہے۔۔۔۔۔" ہو نہ ہو صفدر اسی کا ذکر کر رہا تھا۔ امجد علی سیٹھ ہے۔ نہیں۔۔۔۔۔ سیٹھ تو وہ ہر شخص کو کہتا ہے۔ اس نے کہا تھا۔۔۔ " امجد علی سیٹھ پڑوس میں رہتا ہے۔۔۔۔۔ پنشن کا زمانہ قریب ہے مگر سال بھر ہوا کہ دوسری شادی کر بیٹھا۔۔۔۔۔ بیوی سنبھلتی نہیں سیٹھ سے، اور اب مال یاروں کا۔۔۔۔۔ یہ کیا چیز ہے۔ رس بھری ہے۔ رس بھری۔۔۔۔۔ دوست اب کی سے ایسی ہنڈیا پکائی ہے کہ تم بھی للچا جاؤ گے۔۔۔۔۔"

اس کا کروٹ بدلنے کا جی چاہ رہا تھا۔ اس طرح اوندھے لیٹے لیٹے بدن دکھنے لگا۔ مگر صفدر منع کر گیا تھا۔ کروٹ بدلنے سے شاید خون زیادہ بہنے لگے۔ سینے کے نیچے دبا ہوا ہاتھ سُن ہو چلا تھا۔ گردن میں درد ہو رہا تھا۔

۔۔۔۔۔ لیکن ہاتھ تو نکال سکتا ہوں سینے کے نیچے سے۔ گردن بھی موڑ سکتا ہوں۔ اس میں تو کوئی ہرج نہیں۔۔۔۔

اس نے بڑی احتیاط سے ہاتھ سینے کے نیچے سے نکال کر بستر پہ پھیلا دیا۔ اور آہستہ سے گردن موڑ کر دوسری سمت دیکھنے لگا۔ دیوار پر کسی ریڈیو کمپنی کا کیلنڈر ٹنگا ہوا تھا۔ جس میں ایک عورت کا تین چوتھائی برہنہ جسم ایک بڑے سے ریڈیو سیٹ پہ اس طرح رکھا ہوا تھا کہ خیال ہوتا تھا کہ اگر کیلنڈر زور سے ہل گیا یا ہلا یا گیا تو یہ جسم فوراً فرش پہ آ رہے گا۔

کیلنڈر پہ سے گزرتی ہوئی اس کی نظریں بستر کے اس حصّے پر آ کر ٹھہر گئیں جس

پر اس کا دوسرا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ دور ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ وہ لمحے دو لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کوشش کر کے انگلیوں کو تھوڑا سا آگے بڑھایا اور کپڑے کے ٹکڑے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

..... اس میں دو فیتے بھی بندھے ہوئے تھے۔ کیا چیز ہے یہ؟ ...

باڈی ..... جلدی میں وہ اپنی باڈی یہیں چھوڑ گئی ..... ہاں! یہ اسی کی ہے۔ جس وقت وہ اٹھتے ہوئے طوفان کا مجسمہ بنی کمرے سے باہر جا رہی تھی تو قمیص کے نیچے سے اس کا بھاری سینہ کس زور سے پھڑک رہا تھا۔ ٹھیک ہے۔ اس پر باڈی کا غلاف نہیں تھا ..... جلدی میں چھوڑ گئی ..... بھول گئی۔

..... کتنا چکنا ہے اس کا کپڑا۔ اور کتنا ملائم۔ جیسے ..... جیسے اس کی رانیں۔

...... روشنی کا عکس اس کی رانوں پہ کتنا صاف تھا۔ کتنی گداز تھیں۔ ایک دوسرے کو چھو رہی تھیں۔ سنگھار میز کے آئینے میں اس کا عکس ..... پتلی کمر کے نیچے بھرے بھرے کولھے۔ اُبلتا ہوا سینہ۔ سینے کمر اور کولھوں کا وہ تناسب .....

"تم بھی للچا جاؤ گے۔"

وہ للچایا تو نہیں تھا۔ اس نے تو ارادی طور سے اس کے بدن پہ ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔ بس آئینے میں عکس دیکھا تھا۔ ہاں لمحے بھر کے لئے اس کا جی چاہا تھا کہ اس کی چکنی ٹانگوں پہ ہاتھ پھیرے۔ مگر سر سے پیر تک برہنہ عورت اور وہ بھی اتنی گداز اور تنی ہوئی ...... "رس بھری ہے۔ رس بھری"..... کس کا جی نہیں چاہے گا، کم از کم ہاتھ پھیرنے کو۔!

مگر اس نے تو یہ بھی نہیں کیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہو۔ شاید اس نے اپنی ہتک محسوس کی ہو۔ لوگ کہتے ہیں عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر بے عزتی نہیں۔

لیکن اس نے اس کی بے عزتی کب کی تھی۔ وہ کچھ کو کچھ سمجھ بیٹھے تو اس میں اس کی کیا غلطی۔ وہ صفدر تو نہیں تھا کہ وقت بے وقت۔ بغیر سوچے سمجھے ..... نہ جان نہ پہچان ...... نہ کسی قسم کا تعلق .....۔

......۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ وہ یہاں ہے تو میں صفدر کے گھر آتا ہی نہیں...

..... کب آئے گا صفدر! پانچ منٹ تو اور گزر گئے ہوں گے ۔۔ کب آئے گا ڈاکٹر! .....۔

دیر ہو رہی تھی۔ نقاہت بڑھ رہی تھی۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ غنودگی طاری ہو رہی تھی۔

یکایک رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی دور سے موٹر کار کی آواز کمرے میں داخل ہوئی اور گھڑی کی ٹک ٹک پر غالب آ گئی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر کار کی آواز کو سننے لگا۔ جیسے جیسے آواز قریب آتی گئی اس کی بند ہوتی ہوئی آنکھیں پھیلتی گئیں۔

..... ڈاکٹر آ گیا۔ ورنہ اس وقت ادھر سے اور کون گزرے گا۔ رات گئے یہاں موٹروں کی آواز شاذ و نادر ہی سنائی دیتی ہے۔ یہ ضرور ڈاکٹر کی کار ہے۔۔

آواز ذرا سی دیر میں بلڈنگ کے بالکل نزدیک سے آنے لگی اور دوسرے لمحے بلڈنگ کے سامنے سے گزرتی ہوئی دور چلی گئی۔ اس کی پھیلی ہوئی پتلیاں آہستہ آہستہ سکڑنے لگیں۔ اس کا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اور پھر سناٹا چھا گیا۔

.... کار گزر گئی۔ ڈاکٹر نہیں تھا۔ کوئی اور تھا....۔

باہر کتنا سناٹا ہے! کیسی بوجھل خاموشی ہے۔ دیر سے چھائی ہوئی خاموشی میں اگر ذرا سی حرکت بھی پیدا ہو جائے تو بعد میں خاموشی کا بوجھ اور بھی بھاری لگنے لگتا ہے۔

سناٹے اور خاموشی سے انسان کبھی کبھی ہراساں سا کیوں ہو جاتا ہے؟

بدن کا ہر ریشہ جیسے کان کھڑے کر کے کسی انجانی آواز کو سننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ انسان اچانک کسی ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں توقع کے خلاف مکمل سناٹا ہو تو اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ گویا اس سناٹے کے پیٹ سے کوئی عجیب الخلقت شے نمودار ہونے والی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سناٹا ایک پردہ ہے جو ہٹے گا تو ایسا منظر نظروں کے سامنے ہو گا جسے دیکھنے کے لئے آنکھیں قطعاً تیار نہیں۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا تو اس پر کچھ اسی قسم کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے دو بار باہر کے دروازے پر دستک دی تھی۔ پھر اندر آیا تھا۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ اسے امید بھی نہیں تھی کہ وہاں کوئی ہو گا۔ صفدر برآمدے کو استعمال نہیں کرتا اور نوکر عموماً ساڑھے نو دس بجے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ صفدر ڈرائنگ روم میں ہو گا۔ مگر وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ اور اس وقت ڈرائنگ روم کی تنہائی اور خاموشی میں لمحے بھر کے لئے اس پر وہ کیفیت طاری ہو گئی تھی جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

ضرور انسان کو ایک ناقابلِ بیان طور پر آنے والے خطرات کا پتہ چل جاتا ہے ورنہ اس وقت اس پر وہ کیفیت کیوں طاری ہوئی تھی؟ ہر دوسرے تیسرے روز صفدر کے ہاں جاتا تھا۔ ایسا کئی بار ہوا کہ وہ اس کے ہاں گیا اور صفدر نہیں ملا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ فلیٹ بالکل خالی ملا۔ نہ نوکر نہ صفدر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے کے بعد کہیں صفدر نمودار ہوا۔ پڑوس میں کسی کے پاس تھا یا نیچے سگریٹ لینے گیا تھا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سناٹے اور خاموشی کا یکایک اس شدت سے احساس ہوا ہو کہ ڈر لگنے لگے۔

اس کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہونے لگے اور پلکیں جھکنے لگیں۔ وہ کوشش کرتا کہ آنکھیں کھلی رہیں مگر فوراً پلک جھپک جاتی۔ آخر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

اسی حالت میں اس کا وہ ہاتھ جس کی انگلیاں ریشمی باڈی پکڑے ہوئے تھیں، کھسک کر اس کے چہرے کے قریب آ گیا۔

.... یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟ کس چیز سے آ رہی ہے یہ خوشبو؟ میں نے پہلے بھی کہیں اسے سونگھا ہے۔ کہاں؟ ...... کب؟ .... کوئی سینٹ ہے....

کہاں سونگھا تھا اسے اس نے؟ کب سونگھا تھا؟ صفدر تو سینٹ استعمال نہیں کرتا۔ وہ کوئی بھی خوشبو استعمال نہیں کرتا۔ وہ تو خوشبودار تیل بھی نہیں لگاتا۔

.... ضرور میں نے یہ خوشبو کہیں سونگھی ہے.... شاید آج ہی.... مگر کہاں؟ .... کس وقت؟ ...... آفس میں؟ ..... بس میں؟ .... خالہ جانی کے ہاں؟ ...... نہیں.... تو پھر کہاں؟ .... پھر کہاں؟ ... کہاں؟

'.... ٹھیک ہے ..... ہاں ....'

جب اس نے آخری بار اسے اس زور سے اپنی طرف کھینچا تھا کہ وہ قریب قریب اس پر گر پڑا تھا اور اس کے ملبوس بدن نے اس کے بے لباس جسم کے کئی حصوں کو چھو لیا تھا ...... سینہ۔ ٹانگ۔ شانہ۔ گال ...... اس وقت یہ خوشبو اس کے نتھنوں میں سے در آئی تھی۔ بالکل یہی خوشبو۔

اس نے آنکھیں کھول دیں اور باڈی کو ناک کے پاس لے جا کر سونگھنے لگا۔

..... اس میں لگا ہے سینٹ ...... اس باڈی سے آ رہی ہے یہ خوشبو۔ مگر یہ خوشبو منفرد نہیں۔ اس میں کچھ اور بھی ملا ہے۔ دو تین سینٹوں کا مرکب ہے؟ نہیں ..... ایک خوشبو اور ملی ہوئی ہے ...... نہیں .... یہ تو بدبو ہے۔

پسینے کی بُو۔ عورت کے جسم کی بُو جو سینٹ کی خوشبو سے مل کر کپڑے کے اس ٹکڑے میں بس گئی ہے۔

...... بدن پر کپڑے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہیں اور میرے سامنے آگئی۔ نہ شرم، نہ حیا، نہ لحاظ .... ایک غیر مرد کے سامنے اس طرح بے باکی سے آجانا۔ ایسا تو طوائفیں بھی نہیں کرتی ہوں گی ...... اور وہ تو کوئی ایسی ویسی عورت نہیں معلوم پڑتی .....،

لیکن اسی حالت میں اس نے اسے صفدر کے ساتھ بھی دیکھا تھا۔ مگر اس وقت تو شاید وہ چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ صرف اس کی ایک ٹانگ۔ ایک ہاتھ اور بالوں کی چند لٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔ صفدر اس کی آڑ کئے ہوئے تھا۔ وہ بستر کے اس کنارے پر کروٹ سے لیٹا ہوا تھا۔

...... ہو سکتا ہے کہ وہ میری مداخلت پر بپھر گئی ہو۔ مگر میں نے مداخلت کب کی تھی؟ .....،

اسے اگر معلوم ہوتا کہ وہ دونوں سونے کے کمرے میں اس حالت میں پڑے ہیں اور پھر بھی وہ دروازہ کھول کر جھانکتا تب تو مداخلت کا الزام لگایا جا سکتا تھا۔ مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ اُسے پتہ ہوتا تو وہ ڈرائنگ روم ہی سے واپس چلا جاتا۔ بہت کرتا تو ڈرائنگ روم میں صفدر کا انتظار کرتا۔

...... اور غلطی تو بہرحال صفدر کی تھی۔ یا اس کی بھی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند کیوں نہیں کیا۔ یہ تو چوری اور سینہ زوری ہوئی۔ ناعاقبت اندیشی تو ضرور ہوئی۔ باہر سے آنے والے کو کیا معلوم کہ اندر کیا تماشہ ہو رہا ہے۔

...... یا شاید وہ مجھے بھی صفدر کی قسم کا آدمی سمجھی ہو۔ اس نے سوچا ہو کہ ہے تو آخر اسی کا دوست ...... اسے بھی شامل کر لو۔ ورنہ شاید کہہ دے

کسی سے۔ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔۔۔۔۔ ڈر گئی ہو۔۔۔۔'

اس نے ایسے کئی قصے سنے تھے۔ لوگ کرتے ہیں ایسا۔ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۔۔۔۔۔ مگر اس نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ میں بھی ایسا ہوں؟ ۔۔۔۔۔۔۔ کیا میں شکل وصورت سے ایسا لگتا ہوں؟

۔۔۔۔۔۔ لیکن اس نے تو اس وقت تک میری شکل دیکھی بھی نہیں تھی۔ وہ تو خود اپنا منہ چھپائے ہوئے تھی۔ اور اگر اس کی نظریں میرے چہرے پر پڑ بھی گئیں تھیں تو کیا بس ایک جھلک کافی ہوتی ہے کسی کا کردار بھانپنے کے لئے۔۔۔۔۔۔

اس نے تو دروازہ ذرا سا کھولا تھا۔ اس وقت اس کی نظریں اگر اس کے چہرے پر پڑی ہوتیں تو اسے سوائے شرم، خجالت اور گھبراہٹ کے وہاں کیا نظر آتا۔۔۔۔ اور اس نے گلا صاف کرتے ہوئے جھٹ سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

۔۔۔۔۔۔ ممکن ہے کہ وہ اس آواز کو جو اس وقت میرے گلے سے نکلی تھی غلط سمجھی ہو۔ اس کا کچھ اور مطلب نکالا ہو اس نے ۔۔۔۔۔۔ اسے ایک قسم کا اشارہ تصور کیا ہو۔ بعض کھنکاریں معنی خیز ہوتی ہیں، جیسے کہہ رہی ہو ۔۔۔۔۔ بھائی ہم بھی ہیں ۔۔۔۔۔'

مگر اس نے تو گھبراہٹ میں کھنکارا تھا۔

۔۔۔۔۔ صفدر آئے گا تو اس سے پوچھوں گا ۔۔۔۔۔ وہ ضرور اس کی فطرت سے واقف ہو گا۔ شاید وہ بتا سکے کہ کیا وجہ تھی ۔۔۔۔۔'

اس کے لئے تو جو کچھ ہوا ایک معمہ تھا۔ شاید صفدر اس معمے کو حل کر سکے۔

۔۔۔۔۔ مگر اس کے ساتھ ڈاکٹر بھی ہو گا ۔۔۔۔۔۔ اسے چھپا دوں۔ ورنہ وہ کیا سوچے گا۔ اس حالت میں اور ہاتھ میں خوشبو میں بسی ہوئی ریشمیں! باڈی! پلنگ کے نیچے پھینک دوں۔ مگر میرا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچے گا۔ گرا دوں۔ لیکن

اگر ڈاکٹر بستر کے اس طرف بھی گیا ؟ ۔ تکیے کے نیچے رکھ دوں ...... یہاں ڈاکٹر کی نظر نہیں پڑے گی .....'

اس نے ہاتھ بڑھا کر تکیے کو ذرا سا اُوپر اٹھایا اور باڈی کو اس کے نیچے رکھ دیا۔

ہاتھ کی اس جنبش سے زخم کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کراہنے لگا۔ اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے .....'

.... کتنی دیر اور لگے گی ڈاکٹر کے آنے میں ! .... آدھ گھنٹہ ہوتے آیا صفدر کو گئے۔

...... کمبخت کہیں کا ! کس مصیبت میں پھنسا دیا اس نے مجھے۔ نادان دوست ! ایسوں کی دوستی کا اور کیا نتیجہ نکلے گا۔ حیوان .... حیوان .... حیوان۔ بالکل جانور ..... کُتّا ..... ۔'

...... اور وہ ...... وہ جانوروں سے بھی گئی گزری۔ سر سے پیر تک خواہش۔ آتشکدہ۔

..... اور نہیں تو کیا ..... بے عزتی۔ ہتک۔ ڈر۔ خوف۔ اشارہ۔ سب جھوٹ۔ ابھی ایک کے ساتھ اور ذرا سی دیر بعد دوسرے کی تلاش ... آگ ... آگ۔ آگ۔ کبھی نہ بجھنے والی آگ ......

..... ہاں ! آگ۔ اور اس آگ کے شعلے لپک لپک کر اس کی آنکھوں میں سے جھانک رہے تھے۔ جب میری نظریں پہلی مرتبہ اس کی نظروں سے ملی تھیں اسی وقت مجھے پسینہ آ گیا ......'

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بستر کی طرف کھینچ رہی تھی مگر اس کے قدم جیسے فرش میں گڑ گئے تھے۔

اس وقت اُسے اندازہ ہوا تھا کہ اس نے اسے کمرے میں کیوں بلایا تھا۔ کیوں اسے اشارہ کیا تھا۔ ہاتھ سے ...... اندر آنے کا۔ اس کے بدن کی آگ کے شعلوں کی چمک نے جیسے شکوک کے اندھیرے کی دھجیاں بکھیر دی تھیں اور اسے ....

..... مگر میں اندر گیا کیوں تھا؟ ......

دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر اس نے دو بار ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ مگر کیا ضروری تھا کہ وہ اندر جاتا؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ .....

وہ جھجکا تو تھا .... تبھی تو اس نے دو بارا اشارہ کیا تھا۔ لیکن اس وقت شک وشبہ کی زیادہ گنجائش کہاں تھی۔ ذرا دیر پہلے اس نے اپنی آنکھوں سے اُسے اس حالت میں دیکھا تھا۔ اور پھر وہ سمجھا تھا کہ صفدر بھی اندر ہو گا۔ اس نے تو یہ سوچا تھا کہ شاید صفدر کے کہنے سے وہ اسے اندر بلا رہی ہے۔.....

یکایک رات کی خاموشی میں سے تیر کی طرح گزرتی ہوئی کسی پرندے کی آواز کمرے میں داخل ہوئی..... ٹوہو۔ ٹوہو۔ ٹوہو..... اور اس کے بدن نے ایک مبہم سی جھرجھری سی لی۔

...... الّو کی آواز تھی۔ کتنی بھیانک ہوتی ہے۔ کتنی ڈراؤنی۔ کہتے ہیں اُلّو منحوس ہوتا ہے۔ یہ علاقہ بھی عجیب ہے۔ کہنے کو شہر میں ہے مگر پھر بھی یہاں الّو بولتے ہیں۔ اندھیرا ہوتے ہی کتنا ویران ہو جاتا ہے۔ ابھی ٹھیک سے آباد بھی تو نہیں ہوا۔ یہ بلڈنگ اور اس کے سامنے والی۔ بس یہ دو بلڈنگیں آباد ہوئی ہیں ....

..... نہیں .... پڑوس میں نہیں .... صفدر نے کہا تھا امجد علی اسی بلڈنگ میں رہتا ہے۔ دو ہی تو بلڈنگیں ہیں، باقی تو ابھی بن رہی ہیں۔ یا غیر آباد ہیں۔ سامنے والی بلڈنگ بھی ابھی کچھ دن ہوئے تیار ہوئی ہے۔ دو مہینے ہوئے ہوں گے۔ اور امجد علی کو...... صفدر نے کہا تھا کہ وہ امجد علی کو پڑوسی کی حیثیت سے بہت عرصے

سے جانتا ہے۔ مگر اس کی بیوی سے ملاقات حال کی ہے۔

...... تبھی دوستی ہو گئی۔ ایک ہی بلڈنگ میں جو رہتے ہیں۔ تب تو بڑی آسانی ہوتی ہو گی میل ملاقات میں۔ میاں دن بھر آفس میں رہتا ہو گا اور بیوی گل چھرے اُڑاتی ہو گی۔ آج شاید رات کو بھی فائلوں سے سر کھپا رہا ہو گا۔ یا کہیں اور ہو گا۔ کسی اور کام سے۔ اور بیوی صاحبہ کے لئے میدان صاف۔ کھُل کھیلیں آج ...... میاں کے بڑھاپے کی جگہ صفدر کی جوانی جو مل گئی ......

...... لیکن اس کا کیا قصور ...... آخر جوان ہے۔ اور شوہر بڈھا۔ جو کچھ نہ کر کرنے سے تھوڑا ہے۔

...... ویسے شکل وصورت سے تو شریف معلوم ہوتی تھی۔ آگ نہیں تکلیف، جھانک رہی تھی، اس کی آنکھوں سے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وقتی طور پر اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ اور جب یہ جنون اتر جائے گا تو اس کے ہر انداز، اس کی ہر حرکت سے ان تمام صفات کا پتہ چلے گا جن کے مجموعے کا نام عورت ہے ......

شاید یہ محض اس کا خیال ہو۔

...... مگر میں نے کمرے میں داخل ہو کر جب پہلی بار اُسے دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں آگ اور تکلیف کے علاوہ ایک اور شے بھی نظر آئی تھی جو شرم اور حیا سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی ....

لیکن کمرے میں داخل ہونے کے بعد جس چیز کا نقش سب سے پہلے اس کے ذہن میں پڑا تھا وہ اس کی برہنگی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر بستر کے سرہانے لگے ہوئے زنانے کپڑوں کے ڈھیر پہ پڑی تھی۔ فوراً ہی اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ اور اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ وہ دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ ابھی تک بالکل برہنہ تھی۔ مگر اس حالت میں

بھی اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں ایک قسم کی شرم ......

یا شاید اُسے دھوکا ہوا ہو۔ کیونکہ اس نے تو صرف ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر منہ موڑ لیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں صفدر کو تلاش کرتے کرتے پھر زنانے کپڑوں کے ڈھیر پر جم گئی تھیں۔ جہاں اب تکیہ رکھا ہوا ہے وہیں لگا تھا ان کپڑوں کا ڈھیر۔ ڈھیر کیا ...... بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے پاس۔ دوپٹہ۔ قمیص۔ شلوار......

......مجھے اس باڈی کو تکیے کے نیچے نہیں رکھنا چاہیئے۔ شاید ڈاکٹر تکیہ ہٹائے۔ اسے چادر کے نیچے چھپا دوں۔ وہاں اس کی نظروں سے محفوظ رہے گی۔ ٹھیک ہے...

اس نے ایک ہاتھ تکیے کے نیچے گھسیٹ کر باڈی نکالی اور دوسرے ہاتھ سے گدّے کے نیچے دبی ہوئی چادر کے کنارے کو اوپر کھینچا۔ گدّے کے کھلے ہوئے حصّے پر باڈی رکھ کر اس نے چادر سے چھپا دیا اور چادر کے کنارے کو پھر گدّے کے نیچے دبا دیا۔

اور جب اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا تب بھی اس کے انداز میں قدرے جھجھک تھی۔ کسی اندرونی مجبوری کا شائبہ تھا۔ جیسے کوئی کمزور ہاتھ اس کے ارادوں کی لگام کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن جب وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑا تھا اور اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑا تھا.......

باہر زینے پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ جو آہستہ آہستہ اس فلیٹ کے دروازے کے قریب آ رہی تھی جس کے سونے کے کمرے میں وہ لیٹا ہوا تھا۔

...... ڈاکٹر آ گیا ...... مگر صفدر کہاں رہ گیا؟ ...... یہ تو صرف ایک آدمی کے قدموں کی آواز ہے۔ شاید صفدر پیچھے ہو گا ...... مگر نہیں ...... آواز بند ہو گئی ...... کوئی اور تھا۔ کسی اور فلیٹ میں جا رہا ہو گا۔ ......ہاں! کسی

اور فلیٹ میں ۔۔۔۔۔ آواز بند ہو گئی ۔۔۔۔۔۔

اس دفعہ اس نے اتنی سختی سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا کہ اگر ملحقہ غسل خانے کا باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز نہ آتی تو شاید وہ اتنی آسانی سے ہاتھ نہ چھڑا سکتا۔۔۔۔۔ اس کی گرفت خود بخود ہی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

وہ اس کے پاس ہی کھڑی تھی مگر اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ کنکھیوں ہی سے اس کی طرف دیکھ لیتا۔ اس کی نظریں کچھ دیر تو فرش پہ گڑی رہیں اور پھر اٹھیں تو جا کر سنگھار میز کے آئینے پر جم گئیں۔ اور وہاں ۔۔۔۔۔

قدموں کی آواز پھر آنے لگی۔۔۔۔۔۔ وہی چاپ تھی جو ذرا دیر قبل سنائی دی تھی۔ مگر اب چلنے والا بہت ہی سنبھل سنبھل کر زینہ طے کر رہا تھا۔

۔۔۔۔ وہی آواز ہے۔ شاید زینے پر چڑھنے والا رک گیا تھا۔ مگر آواز تو اوپر کی طرف سے آرہی تھی۔ کوئی اوپر والی منزل سے اتر رہا ہے ۔۔۔۔۔

سنگھار میز کے آئینے میں اس نے پہلی اور آخری مرتبہ اس کے بدن کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ کولھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اس کی بھری بھری رانیں۔ کولھے پر ٹکے ہوئے ہاتھ۔ اٹھتا بیٹھتا سینہ۔ قدرے کپکپاتے ہونٹ۔ جلتی ہوئی آنکھیں۔ سرخ رخسار اور کھلے ہوئے بال گویا کسی نامعلوم تکلیف سے بے تاب تھے۔ مگر اس کے کھڑے ہونے کا انداز جیسے چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ وہ اس تکلیف کو رفع کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرے گی۔ اور اگر کوئی اس کے راستے کا روڑا بنا تو وہ اس کا منہ نوچ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ شاید اسے میری کسی حرکت پر غصہ آگیا ہو۔ یا شاید ناراض صفدر سے ہوئی ہو اور غصہ مجھ پر اتارنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔۔ کسے معلوم ۔۔۔ کون جانے ۔۔۔۔

قدموں کی آواز فلیٹ کے اسی دروازے کے پاس آکر رک گئی جو سونے

کے کمرے میں کھلتا تھا۔

"۔۔۔۔۔ اور قینچی بھی وہیں سنگھار میز پر رکھی ہوئی تھی۔" صفدر نے سونے کے کمرے کے دروازے کے سامنے رک کر جملہ ختم کیا۔ ڈاکٹر دو سیڑھیاں پیچھے تھا۔

سوا بارہ بجے تھے۔۔۔۔۔

جب ڈاکٹر نے وہ دو سیڑھیاں طے کر لیں تو صفدر نے سونے کے کمرے کا زینے پر کھلنے والا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔۔۔ "میں نے پٹی تو باندھ۔۔۔۔۔"

ڈاکٹر کا چمڑے کا بیگ صفدر کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر آ رہا۔ اس کا دوست جسے وہ اپنے ہاتھوں سے بستر پر اوندھا لٹا کر گیا تھا پلنگ کے پاس فرش پر چت پڑا تھا۔ تکیہ جس پر اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے دوست کا سر رکھا تھا سرہانے سے ہٹ کر پائنتی پر آ گیا تھا۔ بستر کی چادر کو جیسے کسی نے جلدی میں گدّے کے نیچے سے کھینچا تھا۔ اور چادر کے الٹے ہوئے حصّے کا ایک کونا اس کے دوست کی گرفت میں تھا۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ اور جب ڈاکٹر اس کے دوست پر جھکا ہوا اس کے قلب کی حرکت محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو صفدر کو یکایک یاد آیا کہ کمرے سے چلتے وقت اس نے ایک ریشمی باڈی بستر کے سرہانے تکیئے کے قریب رکھی دیکھی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کے چہرے پر جمی ہوئی نظریں ہٹا کر بستر کی طرف دیکھا۔ باڈی اب وہاں نہیں تھی۔

۔۔۔۔ اور جب ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ "موت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے واقع ہوئی۔" تو صفدر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اپنے دوست کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی ڈاکٹر کو اور کبھی اس دروازے کو جو زینے پر کھلتا تھا۔

۔۔۔۔ اور جب ڈاکٹر نے پوچھا۔۔۔۔۔ "تم نے کہا تھا وہ تمہاری خالہ زاد بہن ہے؟" تو صفدر نے قالین اور پلنگ کے بیچ میں چمکیلے فرش پر سیاہ پڑتے

ہوئے خون پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا. . . . . "جی . . . . اس پہ
کبھی کبھی دیوانگی کا دورہ پڑ جاتا ہے . . . . . . "

کبھی کھوئی ہوئی منزل بھی...

نئی دہلی ۔ ۱۹۵۳ء

فن کار ۔

زرد رخساروں اور اداس آنکھوں والی سلطانہ سوتے کے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھی میز پوش کاڑھ رہی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ گھر میں خاموشی تھی۔ باہر سناٹا تھا۔

"امّی... امّی!"

انّی دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔

سلطانہ نے کاڑھنا جاری رکھتے ہوئے بغیر سر اُٹھائے پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"امّی... ایک صاحب آئے ہیں۔"

"کون صاحب؟"

"اپنا نام نہیں بتایا۔ کہنے لگے پاکستان سے آئے ہیں۔"

سلطانہ کی نظریں ایک دم انّی کی طرف اُٹھ گئیں۔

"پاکستان سے؟"

"ہاں!..... وہ آپ کو جانتے ہیں۔ اور ہمیں بھی۔"

"تمہیں بھی!"

سلطانہ کی آواز میں تعجب کی لٹک تھی۔

"ہاں... کہنے لگے تمہاری ممّی ہیں؟ میں نے کہا ہیں۔ پھِر کہنے لگے جاکے کہہ دو اپنی ممّی سے ان سے ملنے پاکستان سے ایک صاحب آئے ہیں۔ اُوں امی۔"

"تم نے انہیں بٹھا دیا؟"

"ہاں... اوں امی انہوں نے ہمیں گود میں اٹھایا اُوں پیار کیا۔ اُوں کہا تمہارا نام انّی ہے نا..."

سلطانہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کاڑھنے کا سامان اور میز پوش اٹھایا اور کمرے سے باہر چلی گئی..... انّی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے سے قبل سلطانہ ذرا جھجکی۔ اس نے پہلے دروازے پر ہاتھ رکھ کر لمحہ بھر توقف کیا اور پھر آہستہ سے دھکا دے کر دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔

سامنے ڈرائنگ روم میں ایک شخص دروازے کی طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ وہ ریڈیوگرام پر رکھی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

"آگئیں ہماری امّی"

سلطانہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے انّی کی آواز بادلوں کی گرج سے بھی بھاری تھی۔ وہ چونک پڑی۔ تصویر کے سامنے کھڑے ہوئے شخص نے فوراً مڑ کر ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔

سلطانہ کے دل کی دھک دھک پل بھر کے لئے بند ہو گئی۔

وہ شخص مسکرا رہا تھا۔

سلطانہ کے قدم بڑی مشکل سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، مگر اُس کے ہونٹ پھر بھی نہ ہلے۔

وہ شخص ابھی تک مسکرا رہا تھا۔ مگر ہونٹ اس کے بھی بند تھے

اس نے بڑھ کر انی کو گود میں اٹھالیا اور اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

"میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ باہر تھی۔۔۔ کھیل رہی تھی۔۔۔" جملے اس کے منہ سے ایک ایک کر کے نکل رہے تھے۔ "کتنی پیاری بچی ہے۔"

یکایک اس کے ہونٹ پھر سل گئے۔

سلطانہ کو شدت سے احساس ہوا کہ اسے بھی کچھ کہنا چاہیئے۔

"ارے۔ آپ ابھی تک کھڑے ہیں۔ بیٹھیئے" صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔۔۔ "بیٹھیئے نا۔۔۔ لائیے اسے مجھے دے دیجیئے۔" مگر اس نے انی کو لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھائے۔

"نہیں ٹھیک ہے" کہہ کر وہ انی سمیت صوفے پر بیٹھ گیا۔ "اور آپ کیا کھڑی رہیں گی۔"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھر نمودار ہو گئی۔

"نہیں" کہہ کر وہ جھٹ سے اس کے بالمقابل ایک دوسرے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ اور میز پوش کے نامکمل پھول پہ نظریں جمانے کی کوشش کرنے لگی۔

پھول پر سے ہٹیں تو سلطانہ کی نظریں اس کی نظروں سے ٹکرا گئیں۔ انی ابھی تک اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور وہ ابھی تک اس کے سر پہ بڑے پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ مگر اس کی نگاہیں سلطانہ کی طرف تھیں۔ سلطانہ کی نظریں پھر جھک گئیں۔ اور اس کے ہاتھ قمیص کے گل دار دامن کو ٹانگوں پہ پھیلانے لگے۔

"یہ تصویر" اس نے ریڈیو گرام پہ رکھی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کیا — "نئی ہے؟"

"ہاں۔ پچھلے سال کھنچوائی تھی۔ جمیل کے ایک خالہ زاد بھائی ہیں۔ کانپور میں رہتے ہیں۔ انہوں نے کھینچی تھی۔ فوٹوگرافی کا بہت شوق ہے انہیں۔ بہت اچھی

تصویریں کھینچتے ہیں۔ میری کئی تصویریں ۔۔۔۔۔"

اگر وہ بیچ میں نہ بول اٹھتا تو سلطانہ کی بات شاید ختم ہی نہ ہوتی۔ "لیکن تم نے ۔۔۔۔۔"

مگر جیسے فوراً کسی نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

سلطانہ بھی چونک پڑی ۔۔۔ اور پہلی مرتبہ اس نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"معاف کیجئے ۔۔۔ لیکن آپ نے مجھے ایک تصویر بھی نہیں بھیجی۔"

"ہاں، نثار نے مجھ سے کہا تو تھا مگر ۔۔۔" وہ کوئی معقول عذر تلاش کرنے سے پہلے بول پڑی تھی۔

انّی اس کی گود سے اتر کر سلطانہ کے پاس آگئی ۔۔۔ سلطانہ نے اس کے بالوں کی دو ایک لٹیں درست کر کے کہا ۔۔ "جاؤ۔ تم جا کر کھیلو اب ۔۔۔۔"

اور جب انّی ان دونوں پر نظریں ڈالتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی تو سلطانہ نے پھر کہا ۔۔۔ "اور دیکھو ۔۔۔ منیر خاں کو بھیج دینا۔"

"اچھا۔" کہہ کر انّی پھدکتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی اور کمرے میں ایسی خاموشی چھا گئی جیسے محاذِ جنگ پر گولی چلنے سے قبل چھا جاتی ہے۔ سلطانہ سر جھکائے میز پوش کے ادھ کھلے پھول پر انگلیاں پھیرتی رہی اور وہ بے باکی سے سلطانہ کو دیکھتا رہا۔

آخر سلطانہ نے سر اٹھایا۔

"تم کب آئے؟"

"آج ہی۔"

"کہاں ٹھہرے ہو؟"

"ہوٹل میں۔"

سلطانہ نے قدرے جھجک کر پوچھا... "کیسے آنا ہوا؟"

وہ مسکرایا... "یوں ہی.... علیگڑھ آیا تھا۔ سوچا لکھنؤ پر بھی ایک نظر ڈالتا چلوں"۔ نہ معلوم پھر کب آنا ہو۔ ہندوستان تو اب بدیس ہے اور یہاں کے باشندے بدیسی... لکھنؤ کتنا بدل گیا ہے۔ یہاں آکر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی!"

"کیوں؟ ۔ افسوس کیوں؟"

"نہ جانے کیوں۔ وہ پہلا سا لکھنؤ نہیں لگتا۔ اس پر پہلی نظر پڑی تو دل بلاوجہ مسرور ہو گیا۔ مگر فوراً ہی بلا سبب رنجور بھی ہو گیا۔"

"کتنے دن رُکو گے؟"

"کتنے دن!.... کل چلا جاؤں گا... کل صبح... میرے پاس زیادہ وقت نہیں..."

"الٰہ آباد جاؤ گے؟"

"وہیں سے تو آ رہا ہوں۔"

"نثار سے ملے تھے؟"

"اسی سے ملنے تو گیا تھا۔ ورنہ الٰہ آباد میں اپنا اب کون ہے.... تمہاری شکایت کر رہی تھی۔"

"کیا؟"

"کہہ رہی تھی نہ جانے کتنی بار تصویر مانگی مگر تم نے ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیا۔"

"وہ تصویر کیا ہوئی؟"

"کھو گئی"۔ اس کے لہجہ میں ندامت تھی۔

"کیا کرو گے تصویر کا؟"

"کیا کیا جاتا ہے تصویر کا!"

سلطانہ چُپ رہی۔

"نثار کہہ رہی تھی خود جا کر لے لو اُس سے مجھے نہیں دیتی۔ غلطی ہو گئی جو میں نے کہہ دیا تمہیں بھیجنا ہے۔ ویسے شاید دے دیتی۔ پوچھنے لگی کیا کرو گی۔ میں نے کہہ دیا تم نے منگائی ہے۔ کہنے لگی اس وقت میرے پاس کوئی تصویر نہیں۔ پھر دیکھا جائے گا۔ لیکن کئی بار تقاضا کرنے کے باوجود اس کی پھر نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔۔۔۔"

"تو تم تصویر لینے آئے ہو؟"

"یونہی سمجھ لو۔۔۔۔"

منیر خاں کمرے میں آیا۔

"بلایا بیگم صاحب؟"

"ہاں۔۔۔ چائے تیار ہے؟"

"جی۔"

"تو لے آؤ۔"

نوکر چائے لانے لگا۔

"اور سنو۔۔۔۔"

نوکر رُک گیا۔

"کچھ کھاؤ گے؟"

"نہیں۔۔۔ شکریہ۔"

"جاؤ۔ بس چائے لے آؤ۔۔۔۔"

نوکر چلا گیا۔

سلطانہ نے پوچھا۔ ”چاء کی رفتار ابھی تک وہی ہے یا کچھ کم ہوئی؟“

”بڑھ گئی۔۔۔ کراچی میں چاء بہت پی جاتی ہے۔ مرطوب جگہ ہے۔“

”سنا ہے بہت اچھا شہر ہے۔ جیسے دیکھو کراچی کا رُخ کرتا ہے۔“

”شہر تو اچھا ہے مگر آبادی بہت گنجان ہے۔۔۔ کبھی کبھی تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔“

”مگر تم تو نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کرتے پھرتے ہو۔ سارا وقت کراچی میں تھوڑی رہتے ہو۔“

وہ ہنسا۔ ”تم سے نثار نے کہا ہو گا۔۔۔ جھوٹ بولتی ہے۔۔۔ جی ضرور چاہتا ہے کہ مارا مارا پھروں مگر یہ بھی اپنے بس میں تھوڑی ہے۔ بس ایک مرتبہ چند ہفتوں کے لئے شمال کی طرف جانا ہوا تھا ورنہ شروع سے کراچی میں ہوں۔“

منیر خاں چائے لے کر آیا۔ سلطانہ نے مرکزی میز پر سے گلدان ہٹا کر چائے کی ٹرے اس پر رکھ دی اور چائے بنانے لگی۔

”وہی دو قطرے دودھ اور ایک چمچہ شکر؟“

جواب میں وہ مسکرا دیا۔

سلطانہ چائے کی پیالی لے کر اس کے پاس گئی۔ اس نے پیالی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو سلطانہ کی انگلیاں جو طشتری پکڑے ہوئے تھیں اس کے ہاتھ سے مس ہو گئیں۔ طشتری لرزی اور پیالی میں سے چھلک کر تھوڑی سی چائے طشتری میں اور تھوڑی سی اس کے پتلون پر گر پڑی۔

سلطانہ کے چہرے پر پشیمانی کے نقش ابھرتے دیکھ کر اس نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔“

سلطانہ نے جھک کر چائے کی نمی دوپٹے کے پلّو میں جذب کی اور جا کر اپنی

جگہ بیٹھ گئی۔

"تم نہیں پیو گی؟"

"نہیں ..."

"کیوں؟"

"مجھے ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔"

اس نے دو ایک گھونٹ حلق سے اتار کر کہا ... "ایک بات پوچھوں؟"

سلطانہ کی خاموشی میں اثبات تھا۔

"برا تو نہیں مانو گی؟"

"میں کیوں ماننے لگی برا۔"

"یہ تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے؟"

"مجھے کیا ہوا۔ بھلی چنگی تو ہوں۔"

"میں آج تمہیں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں؟"

"مگر مجھے ہوا کیا۔ جیسی تھی ویسی ہوں۔"

"بالکل ویسی!۔ رنگت اتنی ہی زرد ہے جتنی ہمیشہ تھی۔ آنکھوں کے گرد وہی حلقے پڑے ہیں جو ہمیشہ پڑے رہتے تھے۔ ٹھیک ہے نا!۔"

وہ شے جو اچھل کر اس کے حلق میں پھنس جانا چاہتی تھی اور جسے سلطانہ ابھی تک کسی طرح اپنے سینے میں روکے ہوئے تھی اس کے قابو سے باہر ہو گئی۔ اور اسے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

"تم جمیل کے ساتھ نینی تال کیوں نہیں گئیں؟"

"مجھے پہاڑ کی آب و ہوا موافق نہیں آتی۔"

"یہی نثار بھی کہہ رہی تھی۔ مگر نہ اسے تمہاری بات کا یقین ہے اور نہ مجھے۔ اور

نہ شاید جمیل کو۔"

"تمہارا مطلب ہے میں ان سے دُور بھاگنا چاہتی ہوں۔۔۔ ہے نا!۔۔۔"

سلطانہ کے لہجہ میں تیزی آگئی تھی۔

"نہیں۔۔۔ تم اپنے آپ سے دُور بھاگنا چاہتی ہو۔ تم ماضی میں رہنا چاہتی ہو اور یہ جمیل کی موجودگی میں ممکن نہیں۔ اس لئے تمہیں ہر وہ لمحہ پیارا ہے جو تم جمیل سے دُور رہ کر گزار سکو۔۔۔"

سلطانہ ایک کھوکھلی ہنسی ہنسی۔"ماضی!۔ جس میں اس نے دھوکے کھائے ہوں اس ماضی میں واپس جانے کی خواہش کسی صحیح الدماغ انسان کو تو ہو نہیں سکتی۔ پاگلوں کی بات الگ۔"

"میں پاگل تو نہیں کہ اپنے ماضی میں بھٹکتی پھروں۔"

اس نے ایسا محسوس کیا جیسے سلطانہ نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ اس نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔"ستو سلّو۔۔۔"

اپنا یہ نام سن کر سلطانہ کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔

"۔۔۔۔ دھوکے کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ دھوکہ ہے جو کسی کو دیا جاتا ہے۔ اور ایک وہ جو انسان اپنے آپ کو دیتا ہے۔ دونوں قسمیں بُری ہیں۔ مگر دوسری زیادہ۔ تم کہتی ہو تمہیں دھوکا دیا گیا۔ مگر تمہیں اس کا پتہ تو چل گیا۔ لیکن وہ دھوکا جو تم اپنے آپ کو دے رہی ہو اس کا تمہیں آج تک پتہ بھی نہیں چلا۔ اور اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ تمہارا یہ دھوکہ تمہاری ذات تک محدود نہیں۔ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں اس کا اثر جمیل پر پڑنا لازمی ہے۔ تم خود سوچو اس کی کیا خطا ہے۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہارے آرام و آسائش کا خیال رکھتا ہے۔ اور یہ نہ بھولو کہ شادی تم نے اپنی مرضی سے کی ہے۔ بڑا اعتماد تھا تمہیں

اپنے اوپر۔ بڑا یقین۔ کہاں گیا وہ اعتماد؟ کیا ہوا اُس یقین کا؟"
"تو تم مجھے نصیحت کرنے...."
انیؔ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔
"ہم بھی چائے پئیں گے۔"
سلطانہ نے ایک پیالی میں بہت سا دودھ اور تھوڑی سی چائے انڈیلی۔
اُس نے انیؔ کو اپنے پاس بلایا مگر وہ اس کے پاس جانے کی بجائے اپنی ماں کے پاس آگئی۔
"چلی جاؤ بیٹی۔" سلطانہ نے پیالی میں شکر گھولتے ہوئے کہا۔
"اُوں۔" انیؔ کو شرم آرہی تھی۔
"لاؤ۔ ہم لاڈلی بیٹی کو چائے پلائیں۔"
"لیو۔" سلطانہ نے طشتری اور پیالی اُس کے ہاتھ میں دی۔ "ان کے پاس لے جاؤ وہ پلا دیں گے...."
شرماتی۔ لجاتی۔ دونوں ہاتھوں سے طشتری پکڑے انیؔ آہستہ آہستہ اس کے پاس گئی۔ اس نے طشتری اور پیالی کو تپائی پر رکھ کر انیؔ کو اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا اور اُسے چائے پلانے لگا۔
"انیؔ بیٹی۔ تم پڑھتی لکھتی بھی ہو کہ بس کھیلا کرتی ہو؟"
"واہ۔ ہم اسکول جو جاتے ہیں۔"
"اور اسکول میں کیا پڑھتی ہو؟"
"پوئٹری اول...."
"اچھا کوئی پوئٹری سناؤ۔"
انیؔ پھر شرمانے لگی۔

"سناؤ بھئی۔ ہم بھی تو دیکھیں اتی بیٹی کو کچھ یاد بھی ہے کہ بس یونہی۔"

"او۔ و۔ و۔ ں۔"

سلطانہ نے کہا۔ "سنا دو بیٹی۔"

"جھوٹ بول رہی تھی۔ اسے یاد واد خاک نہیں۔"

"واہ یاد کیوں نہیں..... سنادو بیٹی۔ جیک اینڈ جل سنا دو۔"

مگر اتی پوئٹری سنانے کی بجائے تیر کی طرح دروازے کی طرف بھاگی۔

وہ ہنسا..... "شرماتی ہے۔"

سلطانہ نے دونوں خالی پیالیوں کو تپائی پر سے اٹھا کر ٹرے میں رکھا اور نوکر کو آواز دے کر تپائی کے پاس رکھی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ نوکر چائے کا سامان لے کر چلا گیا تو اس نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگائی اور دھوئیں کے پردے میں سے چھت کے شہتیروں کو دیکھنے لگا۔ سلطانہ کبھی اس کی طرف دیکھتی کبھی اپنے ناخنوں کی طرف اور کبھی ایک کلائی کے گرد پڑی ہوئی چوڑیوں کو گننے لگتی۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔

اس مختصر خاموشی کے طویل طلسم کو سلطانہ نے توڑا۔

"آنا کیسے ہوا؟"

"یہاں؟۔"

"نہیں۔ گھر۔ کسی خاص کام سے آئے ہو یا یونہی۔؟"

"بڑے پیسے خرچ ہوتے ہیں ہندوستان آنے میں۔ یونہی تو وہ آئے جو گانٹھ کا پورا ہو۔ اور میں ٹھہرا غریب آدمی۔"

"تو پھر۔؟"

"نعیم اور نصرت کو لینے آیا ہوں..... دونوں نے ہائی اسکول کر لیا ہے۔

کراچی لے جا کر کالج میں داخل کرا دوں گا۔"

"سچ۔؟"

"ہاں۔ اور اماں بھی جا رہی ہیں...... تمہیں تعجب ہوا۔؟"

"تعجب نہیں...... سوچ رہی ہوں تم ان سب کا بوجھ اُٹھا لو گے۔ جو ایک کی ذمہ داری لینے سے کتراتا تھا وہ تین کی ذمہ داری کیسے سنبھالے گا۔"

"تم بھولیں نہیں۔ مگر یہ بھول گئیں کہ ان لوگوں کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا تھا......"

"اب چھوڑو بھی اس قصے کو۔"

"...... تبھی تو کسی اور کی ذمہ داری لینے سے انکار کرنا پڑا......"

"میں کہتی ہوں چھوڑو بھی اس قصے کو۔"

"...... اور اسی وجہ سے کسی اور کے......"

سلطانہ چلائی۔ "سنا نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

بقیہ الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے...... اس نے متعجب ہو کر سلطانہ کی طرف دیکھا...... وہ گردن جھکائے بیٹھی تھی۔

"مجھے معاف کر دو۔" سلطانہ نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے سلّو۔؟"

"مجھے معاف کر دو۔"

"معافی کی بات نہیں۔ مگر تمہیں......"

سلطانہ جا کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ "ناراض ہو گئے۔؟"

وہ اس کے اور قریب آ گئی۔ "بولو!۔"

"کیا۔؟"

"ناراض ہو گئے۔؟"

وہ ہنسنے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔ "اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ ہاں مجھے تعجب ضرور ہوا کہ۔۔۔۔"

وہ اس کے بالکل قریب آگئی۔ "نہیں کہو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔ کہو۔"

اس نے پھر ہنسنے کی کوشش کی۔

"اس میں ناراضی اور معافی کی کیا بات ہے!"

"جھوٹے کہیں کے۔ کہو معاف کر دیا۔ کہو۔ ورنہ میں کھینچتی ہوں بال۔ کہو۔"

"بال حاضر ہیں۔ سر حاضر ہے۔"

"تو لو۔"

سلطانہ نے اس کے لمبے۔ بکھرے ہوئے بالوں کی ایک لٹ کو آہستہ سے کھینچا۔

"اب کہو۔"

"اونہہ۔"

"اچھا!"

سلطانہ نے لٹ کو زور سے کھینچا۔

"اب!"

"اونہہ!"

"ضدی کہیں کے!"

اس نے لٹ کو چھوڑ دیا۔

"یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں۔"

"شریر کہیں کے!"

سلطانہ جا کر صوفے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

"کبھی اس گنجان جنگل کو چھٹوانے کا بھی خیال آتا ہے کہ نہیں۔"

"جانتی ہو مجھے چھوٹے بال پسند نہیں۔"

"نہ سہی۔ کم از کم انہیں سنبھال کر تو رکھا کرو۔"

"بہت سنبھالتا ہوں۔ مگر یہ کتے کی دُم کی طرح پھر ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔ میں کیا کروں۔"

"لائیں سنبھال دوں۔"

سلطانہ نے ایک ہاتھ اس کے سر پہ رکھا۔ اور دوسرا اس کے کوٹ کے اندر کی جیب کی طرف بڑھایا۔ اور کوٹ کی اندرونی جیب سے کنگھا ایسے نکال لیا جیسے اسے اس جیب میں کنگھے کی موجودگی کا علم تھا۔

"بھئی کمال ہو گیا۔ تمہیں یہ تک یاد ہے۔"

"جی۔ دیکھا آپ نے۔ اور کہیں تو یہ بھی بتا دوں کہ باقی جیبوں میں کیا کیا رکھا ہے۔"

سلطانہ آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں کنگھا پھیرنے لگی اور اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

سلطانہ نے گنگنانا شروع کیا۔

"ذرا زور سے سلّو۔"

مگر سلطانہ اسی طرح گنگناتی رہی۔

جب بال سنبھل گئے تو سلطانہ نے کئی بار ان پہ آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا۔ پھر جھک کر مانگ نکالنے لگی۔ اور جب مانگ نکل گئی تو اس نے اور جھک کر کنگھا واپس اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ دیا۔ ایسا کرنے میں سلطانہ کے سینے نے قریب قریب اس کے سر کو چھو لیا۔ سلطانہ نے ایک پھریری سی لی۔ قدرے جھجکی اور پھر ہونٹ بھینچ کر اس نے اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

آہستہ آہستہ سلطانہ کا سر پھر اس کے سر پہ جھکنے لگا۔ حتیٰ کہ اس کے بھنچے

ہونے ہونٹوں نے اس کے بالوں کو چھو لیا اور سلطانہ کی آنکھیں جیسے آپ ہی آپ بند ہو گئیں۔ مگر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اُسے صوفے کے پیچھے کھڑی سلطانہ کا اپنے سر پر جھکا ہوا چہرہ اور اس کی بند آنکھیں نظر آئیں۔ اس کے ہونٹوں کے گوشوں میں ایک خفیف سی جُنبش ہوئی مگر اس کا بدن بُت کی طرح ساکت رہا۔

یکایک سلطانہ نے آنکھیں کھول دیں۔ جیسے چونک پڑی ہو۔ اس نے تیزی سے اپنا چہرہ اس کے بالوں پر سے ہٹایا۔ گھبرائی ہوئی نظروں سے دو ایک بار اِدھر اُدھر دیکھا اور دھکا دے کر اس کے سر کو اپنے سینے سے جُدا کر دیا۔

"تم یہاں کیوں آئے۔؟"

سلطانہ کی تیز آواز کمرے کی خاموشی میں ایسے گونجی جیسے بھٹک کر کسی گہرے کنوئیں میں اُتر گئی ہو۔

اس نے گردن موڑ کر حیرت سے سلطانہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"میں پوچھ رہی ہوں تم یہاں کیوں آئے؟"

سلطانہ کی آواز میں سختی تھی۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلطانہ کے چہرے کو تکتا رہا مگر کہہ کچھ نہ سکا۔

"بولتے کیوں نہیں؟ ..... کیا لینے آئے ہو یہاں۔؟"

وہ سوچ رہا تھا چُپ رہے یا کچھ کہے۔

"جاؤ۔ چلے جاؤ، یہاں سے۔"

سلطانہ کی آواز اور سخت ہو گئی تھی۔

اس کے چہرے پر حیرت کے نقوش اور گہرے ہو گئے۔

"سُنتا نہیں۔ میں کہہ رہی ہوں چلے جاؤ یہاں سے۔"

اس کے بدن نے دو ایک خفیف جُنبشیں کیں۔

"نکل جاؤ یہاں سے!"

انّی آکر دروازے میں کھڑی ہو گئی اور تعجب سے دونوں کو دیکھنے لگی۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ اُس نے ایک نظر انّی پر ڈالی۔۔۔۔۔ لمحہ بھر سلطانہ کے چہرے کو دیکھا۔ اور اس کے چہرے پر سے حیرت کے نقوش مٹنے لگے۔ وہ باہر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پاس رُک کر اس نے سلطانہ کی طرف پھر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں نے ہلکی سی جنبش کی جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ مگر وہ جنبش مسکراہٹ میں بدل گئی اور وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آتے ہی سلطانہ کے چہرے کی سختی دھول بن کر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے صوفے کی پشت کو مضبوطی سے پکڑا۔۔۔۔۔ سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی صوفے کے سامنے آئی اور بے سُدھ ہو کر صوفے پر گر پڑی۔

انّی دبے قدموں اس کے پاس آئی۔

آئیں امّی۔۔۔۔۔ آ نکل گئے، ہ؟"

زرد رخساروں اور اُداس آنکھوں والی سلطانہ نے انّی کو گود میں بٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"ہاں۔۔۔۔"

سلطانہ کی آواز اتنی کمزور تھی کہ انّی کو اپنا سوال دُہرانا پڑا۔

پکّا گانا

نئی دہلی۔ ۱۹۵۲ء

ساقی	سوغات	نئی لکیر (ہندی)،
کراچی	بنگلور	رامپور

"....اس سے اچھا تو یہ ہے کہ ڈانسنگ اسکول کھول لے۔ اور نہیں تو کیا! جیسے ٹھیکا لے رکھا ہے۔ ڈانس سکھانے کا۔ میں کہتی ہوں یہ آثار اچھے نہیں۔"

"لیکن اس میں برائی کیا ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔"

"تمہیں کیوں نظر آنے لگا۔ تمہاری آنکھوں پر تو...."

"پردے پڑ گئے ہیں۔ ہے نا، اور تمہاری عقل پر پتھر۔ جو سوچتی ہو الٹا سوچتی ہو۔"

"ہشت! میں تو تمہارے بھلے کی کہتی ہوں۔ بدنامی ہو گی تمہاری ناک کٹے گی تو تمہاری...."

"اور تمہاری نہیں؟"

"میری کیوں کٹنے لگی۔ لڑکی تمہاری ہے یا میری؟"

"شبو ایسی لڑکی نہیں۔ تم تو خواہ مخواہ۔"

"ایسی لڑکیوں کے سر پہ کیا سینگ ہوتے ہیں۔ جوان ہے، عمر نکلی جا رہی ہے جو کچھ نہ کر گزرے تھوڑا ہے۔ میں کہتی ہوں سر پہ ہاتھ رکھ کر روؤ گے۔"

"تم تو ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔"

"اسی کا تو رونا ہے۔ تمہیں تو لاڈلی بیٹی کی ہر بات ذرا سی معلوم ہوتی ہے۔ کمرے کا دروازہ بند ہے۔ ریڈیو گرام بج رہا ہے، کیا ہو رہا ہے؟ ڈانس سکھایا جا رہا

سے، کسے؟ ایک صاحب کو، پہلے کبھی نہ شکل دیکھی نہ نام سُنا۔
ننھی بچّی ہے نا۔ جس نے انگلی پکڑلی اس کے ساتھ ہولی۔ اور پھر نہ کسی سے پوچھا نہ گچھا نہ کسی سے اجازت مانگی۔"

"اجازت مانگتی تو تم انکار کر دیتیں؟"

"اور تم ہاں کہہ دیتے؟"

"مگر میں کہتا ہوں شبو بچّہ تو نہیں۔ اپنا بُرا بھلا سوچ سکتی ہے اور ملے جلے گی نہیں تو کیا ساری عمر یہیں بیٹھی رہے گی۔"

"ایسا اندھا کون ہوگا۔ نہ شکل نہ صورت۔"

"آخر تم کیوں اس کے راستے کا روڑا بنتی ہو۔ نہیں ملے تو نہ سہی۔"

"میں کیوں بننے لگی اس کے راستے کا روڑا۔ اس کا جو جی چاہے کرے۔ تم جانو اور تمہاری بیٹی، میں تو جب پوچھوں گی جب کچھ کرکے دھرے گی۔ اور یہ کتاب اب بند کرو۔"

"کیوں؟"

"مجھے نیند آرہی ہے۔"

"اور تم؟"

"میں ابھی پڑھوں گا۔"

"پڑھنا۔ پڑھنا۔ پڑھنا۔ دن رات پڑھنا۔ ہُنہ!"

مائی ڈیئر بچی۔

خط کا جواب دینے میں ذرا دیر ہوئی تو ناراض ہوگئیں۔ شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ گئیں۔ میں نے تو پہلے ہی معافی مانگ لی تھی۔ جانتی تھی کہ میری بچی بڑی

تنک مزاج ہے۔ ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہے اور پھر منانے کا نام نہیں لیتی۔ اچھا بھئی ایک بار پھر۔ اب کے سے ہاتھ جوڑ کر، معافی مانگتی ہوں۔ ہاں تمہاری آپا تم سے معافی مانگ رہی ہے کیا اسے معاف نہیں کرو گی! کیا اپنی آپا سے اتنی خفا ہو۔

مشغولیت نہیں، اسے کاہلی کہہ سکتی ہو۔ ادھر کچھ عرصہ سے کاہلی مجھ پر اس بُری طرح سے چھائی ہے کہ جتنا میں اپنے پروگراموں کا دائرہ تنگ کرتی جاتی ہوں اتنا ہی میری کاہل مشغولیت کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ گھنٹے گزر جاتے ہیں کہ میں کچھ نہیں کرتی۔ مگر پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ تمام گھنٹے میں نے پہاڑ کاٹنے میں گزارے ہیں۔

یہی تو موسم ہے یہاں آنے کا۔ اس بار آنا ملتوی نہ کرو۔ ورنہ ایسا موسم پھر کبھی دیکھنے کو نہ ملے گا۔ تمہارا خیال غلط ہے اس سال گرمی تو یہاں پڑی ہی نہیں۔ عجیب موسم ہے چوبیس گھنٹے کالے دلدار بادل گھرے رہتے ہیں نہ گرجتے ہیں نہ برستے ہیں۔ ہر وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلا کرتے ہیں۔ سچ کہتی ہوں۔ ایسا موسم پھر کبھی نہ پاؤ گی۔ جتنی جلدی ہو سکے آجاؤ۔ تم بہت یاد آتی ہو۔ ڈیڈی بھی تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔

حقّی سے ملے عرصہ ہو گیا اب گھر پہ نہیں آتا۔ نہ جانے کیوں کتراتا ہے، سُنا ہے اس کی شادی ہو رہی ہے۔ خان بہادر کی لڑکی سے۔

ان کا نام نعیم ہے قریب قریب روز آتے ہیں۔ میں انہیں ڈانس سکھا رہی ہوں۔ کافی سیکھ گئے ہیں۔ سچ کہتی ہوں نجی۔ میں نے اتنی جلدی ڈانس سیکھتے آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔ تین چار دن میں فاکس ٹراٹ سیکھ لیا ہے۔ تم یقین نہیں کرو گی۔ سلو والٹز وہ اب مجھ سے اچھا کر لیتے ہیں۔ انہیں سلو والٹز پسند بھی بہت ہے۔ ممّی کو زکام ہو گیا تھا۔ مگر اب ٹھیک ہیں۔ ان سے تمہارے آنے کا ذکر کیا

تھا کچھ بولیں نہیں۔

"تمہاری شبو"

"تمہارے سر کی قسم چاچا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

"جا بے!۔ تیری بات کا کون یکین کرے۔"

"قرآن اٹھوالو چاچا۔ جو جھوٹ نکل جائے۔ تو چور کی سزا سو میری۔"

"زبان کو لگام دے چھوکرے۔ کیوں ناحک ایسی باتوں میں پاک کتاب کو لا دے ہے۔ سرم نہیں آتی تجھے!"

"میں جو کہہ رہا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور تم ہو کہ مانتے ہی نہیں، الٹا مجھی کو جھوٹا ٹھیراتے ہو۔"

"اچھا یہ بول تو نے دیکھا کیسے؟"

"میں اوپر جا رہا تھا، شبو بی بی کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ بس جھلک نظر آ گئی۔"

"پر انگریجی ڈانس تو ایسے ہی ہوئے ہے یہ کوئی اپنا ہندوستانی ناچ تھوڑی ہے کہ دور ہی دور رہے۔ یہ تو بلائتی ناچ ہے۔"

"نہیں چاچا میں جو کہہ رہا ہوں کہ میں نے اسے شبو بی بی کی چمی لیتے دیکھا۔ تمہارے سر کی قسم چاچا۔"

"دھیرے بول کسی نے سن لیا تو سامت آجائے گی۔"

"فکر نہ کرو۔ تون باجا جو بج رہا ہے"

"ارے یہ بھنڈیاں کاٹ رہا ہے یا پھل۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر نہیں تو بیگم صاب ایسی کھبر لیں گی کہ بس۔ ہاں تو تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

"تمہارے سر کی قسم چاچا اپنی آنکھوں سے، میں تو جھٹ وہیں سیڑھیوں پہ دُبک گیا۔ ایسے چمٹے ہوئے تھے ایک دوسرے سے۔ پوچھو مت چاچا۔ کہ کیا سین تھا۔"

"پر یہ بول کہ بیگم صاب کو کیسے کھبر ہو گئی۔"

"اپن کو نہیں معلوم۔ پر انہیں خبر ہوئی ضرور۔"

"نئیں۔ مجھے تو یوں جان پڑے ہے کہ نجی بی بی جو آئی ہیں نا۔ تو اُنی کی کھاطر یہ انتجام ہوا ہے۔ دونوں بہنیں پہلے بھی اسی کمرے میں رہو ہے تھیں وہ تو جب سے نجی بی بی کی سادی ہوئی ہے تب سے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر میں نے خود سُنا۔ تمہارے سر کی قسم اپنے کانوں سے سُنا۔ بیگم صاب شبو بی بی سے کہہ رہی تھیں دوپہر کو کمرہ خالی رہتا ہے، تو وہیں سکھایا کرو۔"

"یونہی کہہ دیا ہو گا۔"

"ارے چاچا تم نہیں جانتے بیگم صاب کو۔ بڑی چلتی پرزہ ہیں۔"

"اور سنو لونڈے کی باتیں! میں بیگم صاب کو نئیں جانتوں ہوں، اے جب شبو بی بی کی بالدہ جنت سدھاریں اس سے پہلے سے صاب کے پاس ہوں، اللہ جنت نصیب کرے بڑی نیک بی بی تھیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے چاچا، پر میں تو کہہ رہا ہوں کہ میں نے کتنی بار بیگم صاب کو شبو بی بی کی ٹوہ لیتے دیکھا۔ وہ دروازہ بند کر کے سمجھتی ہوں گی کہ چھپی ہوئی۔ پر بیگم صاب کو ہر بات کی کھبر رہتی ہے، میری مانو چاچا بیگم صاب نے ضرور اسی لئے ہال کمرے کے واسطے کہا۔"

"یوں بھی ہو سکتا ہے اور نجی بی بی کے آنے میں تو ابھی کئی روز باکی ہیں۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا کہ اس ہال کمرے والے معاملے میں کچھ گڑبڑ گھٹالا ضرور ہے۔"

ڈیڈی آج بڑا مزہ رہا۔ جانتے ہیں کیا ہوا۔؟ .... اونہہ ایسے تھوڑی بتاؤں گی۔ اچھا گیس کیجیے ..... اونہہ ...... نہیں ..... غلط .... اچھا میں بتاتی ہوں۔ آج ممّی نے بھی نعیم کے ساتھ ڈانس کیا۔ نہیں انہیں ڈانس سکھایا۔ میں انہیں رمبا سکھا رہی تھی کہ ممّی آگئیں ..... میرے کمرے میں نہیں ہال کمرے میں .... اُفوہ! آپ میری بات تو سنتے ہی نہیں۔ کہہ جو دیا کہ ہم لوگ آجکل ہال کمرے میں ڈانس کرتے ہیں .... افوہ! کتنے سوال کرتے ہیں آپ، اس لئے کہ ممّی نے کہا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ دوپہر کو ہال کمرہ خالی رہتا ہے ہاں تو ممّی آگئیں۔ پہلے تو کچھ دیر دیکھتی رہیں۔ پھر آپ ہی بولیں تمہیں رمبا خود نہیں آتا، سکھاؤ گی کیا۔ اور پھر انہوں نے کہا۔ لاؤ میں سکھاتی ہوں۔ میں تو خود سوچتی تھی کہ ممّی سے کہوں کہ وہ نعیم کو رمبا سکھا دیں۔ مگر ڈر لگتا تھا کہ کہیں انکار نہ کر دیں۔ بس اسی وجہ سے نہیں کہا۔ اور ممّی نے خود آفر کر دیا۔ آپ جانتے ہیں، پورے پچاس منٹ سکھایا ممّی نے۔ ممّی کو رمبا بہت اچھا آتا ہے ..... آپ ہنسی بہت اُڑاتے ہیں۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ ممّی رمبا بہت اچھا کرتی ہیں۔ سچ! اور ممّی نے آپ ہی آپ یہ بھی وعدہ کر لیا کہ وہ انہیں روز رمبا سکھایا کریں گی۔ اور پھر بعد میں گانا بھی ہوا۔ میرا نہیں نعیم کا، میں سچ کہتی ہوں ڈیڈی وہ بہت اچھا گاتے ہیں آواز بالکل سہگل سے ملتی ہے بڑا درد ہے ان کی آواز میں .... نہیں انہیں نہیں پسند آیا۔ ممّی کو تو سوائے پکّے گانوں کے اور کچھ پسند آتا ہی نہیں اور فلمی گانوں سے تو انہیں نہ جانے کیوں نفرت ہے ..... افوہ! آپ پھر کتاب میں کھو گئے۔ میری بات نہیں سنتے ....

سچ ڈیڈی ۔ بالکل سہگل کی آواز ہے' انہوں نے وہ گانا بھی گایا۔۔۔ ۔ ہاں! ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں۔ آپ کو تو بہت پسند ہے نا یہ گانا۔۔۔ انہیں تو' فلمی گانوں سے چڑ سی ہے۔ سبھی فلمی گانے تھوڑی بُرے ہوتے ہیں ۔۔۔۔ ۔ یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔ اور آواز بھی تو کوئی چیز ہے۔ سچ ڈیڈی! اچھا کل ہی سنواؤں گی۔ آپ خود اندازہ لگائیے گا۔ کیا آواز ہے؟۔

میں بستر پر لیٹی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہی تھی ۔ پڑھ کیا رہی تھی بس یونہی ورق گردانی کر رہی تھی۔ نیند نہیں آرہی تھی اس لئے کتاب اٹھالی تھی' ویسے تو میں جلد سونے کی عادی ہوں ۔ مگر اس رات نہ جانے کیوں پپوٹے بھاری ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ حالانکہ سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ شور وغل کا ذکر کیا سرگوشیاں تک معدوم تھیں گھر میں صرف ڈیڈی تھے۔ سو وہ شام سے اپنی لائبریری میں گھسے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد مجھ سے دو ایک اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ پھر پائپ سلگایا اور چلے گئے۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ شبو آپا اور ممی باہر گئی ہوئی تھیں ۔ نعیم صاحب کی روزہ کشائی جو تھی۔ ممی بھی کبھی بڑے مزے کی بات کہہ دیتی ہیں ۔ روزہ کشائی! ان کا مطلب تھا نعیم صاحب پہلی مرتبہ بال روم میں ڈانس کریں گے۔ کئی روز پہلے پروگرام بن چکا تھا۔ شبو آپا مصر تھیں کہ میں بھی چلوں گی ۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا' اوّل تو مجھے ڈانس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں اور دوسرے میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ میری موجودگی سے ان کی ۔ میرا مطلب ہے شبو آپا اور نعیم صاحب کی ایوننگ میں کسی قسم کی کمی رہ جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ ممی کا ان لوگوں کے ساتھ جانا بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر شبو آپا شاید ممی کی موجودگی کو ضروری سمجھتی تھیں ۔ معلوم نہیں ممی خود پروگرام میں شامل ہو گئی تھیں یا شبو آپا نے اصرار کیا تھا۔ مگر مجھے اتنا معلوم ہے کہ شبو آپا کو کسی قسم کا اعتراض ہرگز نہ تھا۔

تو اسی وجہ سے گھر میں سناٹا تھا۔ نوکر بھی کھا پی کر سو چکے تھے۔ ممّی وغیرہ کے پروگرام میں رات کا کھانا شامل نہ ہوتا تو نوکروں کو شاید رت جگا کرنا پڑتا۔ کیوں کہ وہ لوگ جلدی لوٹنے والے تھوڑی تھے۔

اور اسی وجہ سے مجھے قدرے تعجب ہوا جب اچانک دروازہ کھُلا اور شبو آپا کمرے میں داخل ہوئیں میری نظریں اُن کے چہرے کا جائزہ لینے سے پہلے خود بخود گھڑی کی طرف اُٹھ گئیں، ابھی تو دس بھی نہیں بجے تھے بہت سے سوالات میرے دماغ میں پھدکنے لگے۔

"بڑی جلدی آگئیں آپ؟"

آپا نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ مجھے ان کی خاموشی کچھ غیر معمولی لگی سرگوشیاں کرتی ہوئی سی وہ ابھی تک دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھیں۔

"ممّی نہیں آئیں؟"

"نہیں۔"

جواب دے کر وہ دو قدم چلیں۔ میز کے پاس آئیں اور اس پر اپنا سرخ بٹوہ رکھ کر پھر ساکت کھڑی ہوگئیں۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گئی، دو ایک سوال میری زبان تک آکر رُک گئے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ کے شیڈ کو اتنا ترچھا کر دیا کہ روشنی شبو آپا کے چہرے پر پڑنے لگی۔

میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔

شبو آپا نے جھٹ سے منہ پھیر لیا۔

"لائٹ آف کر دو نجی۔"

میں نے فوراً بیڈ سوئچ دبا دیا۔

وہ جا کر سڑک پر کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئیں مگر میری نظر اُن کے

چہرے پہ بھرپور پڑ چکی تھی اور میں نے ان کی بھیگی پلکیں، اُن کے ہلدی جیسے گال اور اِن گالوں پہ آنسوؤں کے نشان دیکھ لیئے تھے۔

میں بھی جا کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے آپا؟ تم رو کیوں رہی ہو۔"

مگر انہوں نے جواب نہیں دیا۔

"ممی کہاں ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

"تم رو کیوں رہی ہو۔"

وہ پھر چپ سادھ گئیں اور میری پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔

"آخر ہوا کیا ہے"

جواب ندارد۔

شبو آپا میں سو برائیوں کی ایک بُرائی یہ ہے کہ اگر چُپ سادھ لیں گی تو پھر کوئی کچھ ہی کیوں نہ کرے وہ زبان نہ ہلائیں گی، ایک تو ویسے ہی کم گو ہیں باتیں کرنے کا دورہ تو ان پر سال چھ مہینے میں ایک آدھ بار ہی پڑتا تھا، ادھر کچھ دنوں سے ہنسنے بولنے لگی ہیں۔ ہشاش بشاش نظر آتی ہیں۔ جیسے تپتی ہوئی زمین پہ برسات کا چھینٹا پڑ گیا۔ ورنہ ان کا کام تو بسا اوقات ہوں ہاں سے چلتا ہے، جیسے سُن میری رہی ہوں اور سوچ کچھ رہی ہوں۔ عرصہ ہو گیا اُکھڑی اُکھڑی سی رہتی ہیں اور یہ مرن برت کا مرض دائمی بھی نہیں کوئی پانچ چھے سال پُرانا ہو گا۔

آخر میں نے پوچھ ہی ڈالا۔

"اور نعیم صاحب؟"

یا اللہ! ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میری وحشت چیخنے چلانے

پر ٹل گئی اور کئی وسوسے میرے دماغ کو ٹھوکے دینے لگے۔

لو! وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اور پھوار موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئی جی تو کچھ اور چاہ رہا تھا۔ مگر میں ان کا بازو پکڑ کر انہیں بستر کی طرف کھینچنے لگی۔ اور وہ کھنچی چلی آئیں۔ بستر تک۔ جیسے ان میں جان ہی نہ تھی۔ جو ذرا سی مزاحمت بھی کرتیں۔

انہیں بستر پہ بٹھا کر میں نے اپنا دوپٹا ان کی آنکھوں میں ٹھونس دیا۔ پھر وہ اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش میں سسکیاں بھرنے لگیں۔ اُفوہ! کتنی خوشبو آ رہی تھی۔ ان کے کپڑوں سے۔

مگر معاملہ ابھی صاف نہیں ہوا تھا۔ اور میں نے جیسے قسم کھائی تھی کہ اسے صاف کر کے دم لوں گی۔

"اور نعیم صاحب؟"

وہی چپ۔ مگر اس بار آنسو نہیں ٹپکے۔

"آپا میں کیا پوچھ رہی ہوں؟"

مگر وہ اسی طرح ایک ہاتھ کے سہارے سر جھکائے خاموش بیٹھی رہیں۔ آخر میری وحشت جھلاہٹ بن کر پھٹ پڑی۔

"سُن رہی ہو کہ نہیں!"

ان کی خاموشی ہی ان کا جواب تھا۔

میں نے ہمت ہار دی۔ زیادہ استفسار بے کار ہے۔ میں سمجھ گئی کہ آپا بتائیں گی ضرور مگر اس وقت نہیں۔ چپ ہو گئیں۔ تو بس چپ ہو گئیں۔ اب تو جب یہ چپ ٹوٹے گی تبھی کچھ معلوم ہو گا۔

"آپ لیٹ جائیے۔" میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

اڑ اڑ اڑا دھم۔ جیسے ریت کے گھروندے کو ٹھیس لگ گئی ہو۔ جہاں بیٹھی تھیں وہیں

ڈھیر ہو گئیں، میں نے تکیہ اٹھا کر ان کے سر کے نیچے رکھ دیا اور خود اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ آنکھیں بند تھیں مگر وہ جاگ رہی تھیں، بڑی شدت سے بیدار تھیں۔

بہت دیر ان کے پاس بیٹھی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ ماضی۔ حال۔ مستقبل۔ کل۔ آج۔ کل کے چکر لگاتی رہی۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر دوڑتی رہی حتیٰ کہ میرے ذہن میں بھنبھناہٹ ہونے لگی۔ جیسے میرا ذہن شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہو۔ یہ بھنبھناہٹ تیز اور بلند ہوتی گئی یہاں تک کہ میں گھبرا کر بستر پر سے اٹھی اور جا کر کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔

آسمان پہ بادل تھے، زمین پر اندھیرا تھا، فضا میں خاموشی تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی۔

میرے ذہن کے چھتے میں پھر بھنبھناہٹ شروع ہو گئی اور میرا دم لوٹنے لگا۔ ایک خیال اِدھر سے آتا اور زن سے اُدھر نکل جاتا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا اور کوئی کوئی خیال تو نہ زن سے آتا نہ زن سے جاتا۔ بس جم کر کھڑا ہو جاتا اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر میرا منہ چڑانے لگتا۔

میں گھبرا کر آپا کے بستر کی طرف جانے والی تھی کہ ایک کار کھڑکی کے نیچے سڑک کے کنارے آ کر رکی میں ٹھٹھک گئی، میں کار کو تو پہچان گئی مگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو انسانوں کو پہچان نہ سکی۔ وہ ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ ایسے چمٹے کہ جدا ہونے کا نام نہ لیتے تھے۔ آخر کار وہ جدا ہو گئے اور میرے پھیپھڑوں نے ایک لمبا سانس خارج کیا۔ پھر کار کا دروازہ کھلا۔ ان میں سے ایک باہر نکلا۔ میں پہچان گئی یہ ممی تھیں۔ دوسرے کا صرف ہاتھ باہر نکلا۔ جواب میں ممی نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور یہ جا وہ جا۔

میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ شبو آپا اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"کون تھا؟"

"ممّی!"

میں اُن کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

انہوں نے نظروں کے ذریعہ مجھ سے ایک اور سوال کیا۔ میں نے جواب دیا "ہاں"

اتنے میں زینے پر ممّی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ میرا سارا بدن تن گیا۔ شبو آپا نے پھر گردن جھکا لی تھی۔

قدموں کی چاپ پاس آتی گئی۔ حتیٰ کہ ہمارے کمرے کے سامنے آئی اور آگے نکل گئی۔ ممّی ایک فلمی دھن گنگنا رہی تھیں۔

آپا کا محبوب گیت۔ "ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں"

میری مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"میں ابھی جا کر ڈیڈی سے کہتی ہوں!"

اور میں نے ایک قدم دروازے کی طرف اٹھا بھی لیا۔

مگر آپا کے برف جیسے ٹھنڈے ہاتھ نے میری کلائی پکڑ لی۔ کتنی طاقت آگئی تھی اس کمزور ہاتھ میں۔ میں ہل بھی نہ سکی۔ پھر اس کمزور ہاتھ نے میری کلائی کو ایک جھٹکا دیا۔ اڑاڑ ڑا دھم! جیسے ریت کے گھروندے کو ٹھیس لگ گئی ہو۔ میں شبو آپا کے پاس بستر پر گر پڑی اور میری جلتی ہوئی آنکھوں میں نمی دوڑ چلی۔

یادِ یاراں

کراچی - ۱۹۵۲ء

خیال - لاہور

آپ کا "بادو باراں" "خیال" میں چھپنے کے بعد میں نے پھر پڑھا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ یہ صرف پہلا تاثر نہ تھا بلکہ دوبارہ پڑھنے پر بھی اس کا تاثر اتنا ہی شدید ہے۔ یہ افسانہ واقعی بڑی آرٹسٹک چیز ہے۔ خصوصیت سے موسم اور انسانی جذبات میں جو ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے یہ فن کارانہ ٹچ ہے۔ موسم کی طوفانی کیفیت دو طرح سے اثر انداز ہوئی ہے۔ قیصر کی ظاہری دبی دبی جذباتی کیفیت کے تحت جو ہلچل اور طوفان ہے اس کا سمبالک طور پر موسم کے ذریعہ اظہار ہوا ہے۔ ساتھ ہی کھلونے ہاتھی کے اور نصیر کی تصویر کے گرنے کے سمبالک تجسس کے ساتھ یہ آندھی آنے والی ٹریجڈی کے PREMONITION اور PRESCIENCE کا کام دیتی ہے۔ یعنی ہمیں پہلے سے احساس ہو جاتا ہے کہ اس آندھی کے دوران میں کچھ ہو رہا ہے۔ ایک انسانی زندگی DESTINY کے ساتھ ٹکرا رہی ہے۔۔۔۔ میں مضامین کا مجموعہ چھپواتے ہوئے اپنے مضامین میں کچھ ترمیم کر رہی ہوں۔ اگر میں نے "تکنیک کے تنوع" میں اضافے کئے تو آپ کے اس افسانے کا بھی ذکر کروں گی۔

ممتاز شیریں

احسن زینے کا دروازہ بند کر کے لوٹا تو ما نو پھر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"نئیں۔ نئیں۔ ام تو تتا سات دائیں گے۔"

"چچا تو گئے۔ بیٹے۔" احسن نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ کل پھر آئیں گے تب جانا ...."

"نئیں۔ نئیں۔ ام ابی دائیں گے..."

"ابھی تو گئے وہ۔ ابھی کیسے جاؤ گے..."

"نئیں۔ نئیں۔ نئیں...."

"سنو بیٹے۔ چچا کل تمہارے لئے بہت سی چاکلیٹ لائیں گے۔ اور لالی پاپ لائیں گے، اور کھلونے لائیں گے۔ اور پھر تمہیں گارڈن لے جائیں گے۔"

"ام گارڈن نئیں دائیں گے۔ ام تو تتا سات دائیں گے۔"

احسن نے قیصر کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ "تم بھی بڑی ضدی ہو۔ چلا جاتا تو کیا بگڑ جاتا۔"

قیصر منہ پھلائے بیٹھی رہی۔

"آخر روز جاتا ہے۔ آج کون سی نئی بات ہو گئی۔"

قیصر پھر بھی کچھ نہ بولی۔

مانو نے احسن کی ٹانگوں کے بیچ میں سے سر نکال کر ایک نظر قیصر کو دیکھا۔ ایک نظر احسن کو پھر ٹانگوں میں سر چھپا کر "نیئں۔ نیئں۔ امم تو دائیں گے" کی رٹ لگنے لگا۔

احسن کھسیا گیا۔ "لو اسے۔ مجھ سے نہیں سنبھلتا۔"

قیصر تیزی سے پلنگ پر سے اٹھی۔ اس نے مانو کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے میں اسے احسن کی ٹانگوں سے الگ کیا اور ایک تھپڑ اس زور سے مارا کہ اس کا نرم گال لال ہو گیا۔

"بول۔ پھر ضد کرے گا۔" قیصر نے اس کے دوسرے گال کو نشانہ بناتے ہوئے ڈانٹا۔

"خبردار جو اب نام لیا۔"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور مانو نے سہم کر رونے پر قابو پانے کی کوشش میں ایک گہرا سانس لیا۔ جس نے اس کے سارے بدن کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"ضدی کہیں کا...." قیصر نے مانو کا بازو چھوڑ دیا اور پھر جا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کا منہ اور پھول گیا۔

مانو سسکیاں بھرتا ہوا احسن کے پاس گیا جو سر پکڑے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ "آجا میرے لعل" کہہ کر اس نے مانو کو گود میں بٹھا لیا اور سینے سے لگا کر اُسے پیار کرنے لگا۔ مانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "اچھّے بیٹے روتے نہیں۔" اس نے مانو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میرا بیٹا کتنا اچھا ہے۔ میرا مانو روتا تھوڑی ہے۔ وہ تو بڑا اچھا بیٹا ہے۔" اس نے مانو کے گدگدی کی۔ "وہ دیکھو۔ وہ ہنسا میرا بیٹا۔ وہ ہنسا..."

احسن کافی دیر تک مانو کو چُپ کرانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب بچّہ چُپ ہو گیا تو احسن نے اُسے گود سے اُتار دیا۔ "جاؤ بیٹے اب کھیلو جا کر..."

جب مانو قیصر سے نظریں چراتا کمرے سے باہر چلا گیا تو احسن نے قیصر سے کہا۔ "یہ تم نے اچھا نہیں کیا..."

"کیا اچھا نہیں کیا؟ ..." قیصر نے سوال کم کیا اور ڈانٹا زیادہ۔

"تم نے مانو کو اس کے ساتھ کیوں نہیں جانے دیا؟"

"میری مرضی ..."

"اور روز جو جاتا تھا؟ ..."

قیصر چُپ رہی۔ احسن آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"سچ بتا قیصی۔ کیا بات ہے۔ تو اس سے ایک دم اتنی خفا کیوں ہو گئی ہے۔"

اس نے قیصر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی اُنگلیاں گِننا شروع کر دیں۔

"بات وات کچھ نہیں ..." قیصر کا پھولا ہوا چہرہ کچھ پچکا۔

"بات تو کچھ ضرور ہے۔"

قیصر کا چہرہ پھر پھُول گیا۔ "کہہ دیا بات وات کچھ نہیں۔ بس میں نہیں چاہتی کہ وہ مانو کو لے جائے۔"

"مگر کوئی سبب بھی تو ہونا چاہیئے۔ یا بس یونہی ..."

"کہہ جو دیا۔ میری مرضی ..."

احسن نے قیصر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "مگر یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم تو جانتی ہو وہ کِتنا حساس ہے۔"

"ہے تو ہوا کرے۔ مجھ پر کیا احسان کرتا ہے ..."

"احسان کا سوال نہیں ..." احسن کے لہجے میں سنجیدگی اور بھاری پن آ گیا۔ "اچھے آدمی کی قدر کرنا چاہیئے ..."

قیصر نے سوئیٹر بُننا شروع کر دیا۔

"..... اور نصیر تو سونا ہے۔ سونا ....."

سوئیٹر کی سلائیاں تیز تیز چلنے لگیں۔

"...۔ کتنی محبت کرتا ہے اپنے مانو سے...."

اوُن اُلجھ گیا۔

"..... وہ میرا سب سے عزیز دوست ہے..."

اوُن سلجھانے میں سلائی قیصر کی اُنگلی میں چُبھ گئی۔ اس نے کہا۔ "ہوگا۔ مگر میرا کیا واسطہ ہے اس سے۔" اُس کا چہرہ پچک کر بہت لانبا لگنے لگا تھا۔

"تیرا کیا واسطہ!...." احسن مسکرا دیا..." اور جس نے تیری بیماری میں رات رات بھر تیری خدمت کی وہ کون تھا!...."

سوئیٹر پھر تیزی سے بُنا جا رہا تھا۔

"......۔ کبھی ڈاکٹر کو بُلانے چلا جا رہا ہے، کبھی دوا لینے بھاگا جا رہا ہے۔"

شاید پھندے ٹھیک سے نہیں نظر آ رہے تھے کیونکہ قیصر سلائیوں پر جُھکتی چلی جا رہی تھی۔

"...۔ تو نے خود ہی تو کہا تھا میں اگر یہاں ہوتا تب بھی شاید تیری اتنی اچھی تیمار داری نہ ہو پاتی۔ جتنی اچھی کہ نصیر نے کی....۔ اور آج میں تجھے ایک بات بتاتا ہوں...."

بُنائی لمحہ بھر کے لئے رُک گئی۔

"..... جو میں نے تجھے آج تک نہیں بتائی۔ تیری بیماری میں اُس نے جتنا روپیہ خرچ کیا اس میں سے ایک پائی بھی واپس نہیں لی۔"

سلائیوں پر جُھکا ہوا سر اوپر اٹھ گیا۔ "تم نے مجھے آج تک کیوں نہیں بتایا؟"

"بتا کر کیا خود مصیبت میں پھنستا۔ تم کہتیں فوراً روپیہ واپس کر دو۔ اور وہ لینے سے انکار کرتا، شامت دونوں طرف سے آتی..."

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

"تم کل ملو گے اس سے؟..."

"شاید..."

"شاید نہیں۔ تم کل ضرور اس سے ملو اور وہ سب روپیہ واپس کر دو..."

"اسی مارے تو میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا۔"

"تم نے اگر کل ہی اُسے روپیہ واپس نہ کیا تو اچھا نہ ہوگا..."

"تو تم خود ہی واپس کر دینا۔ جب وہ یہاں آئے..."

قیصر نے ذرا رُک کر کہا۔ "وہ اب یہاں کبھی نہیں آئے گا..."

کچھ تو قیصر کے جملے کے مفہوم اور کچھ اس کے لہجے کی تبدیلی نے جیسے احسن کو جھنجھوڑ ڈالا۔

وہ ٹکٹکی باندھ کر قیصر کی طرف دیکھنے لگا۔ قیصر سلائی پر چڑھے ہوئے پھندے گننے کی کوشش کر رہی تھی۔ "کیوں؟..."

قیصر کی نظریں پھندوں پر جمی رہیں... "میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ اب کبھی یہاں نہ آئے۔"

احسن کے منہ سے پھر ایک "کیوں؟" نکل گئی۔

قیصر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہاں آئے۔"

"کب کہا تم نے اس سے؟"

"آج..."

"آج؟..."

"ہاں۔ تمہارے آنے سے پہلے..."

احسن کے دماغ کی نظروں کے سامنے نصیر کا وہ چہرہ پھر گیا جو اس نے کمرہ میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا اور جس پر اُداسی کا نقش اس وقت غیر معمولی طور پر

گہرا تھا.... "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔"

اس کے لہجے میں شکایت کم افسوس زیادہ تھا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ ادھر کچھ دنوں سے تمہارا مزاج بے حد چڑچڑا ہو گیا ہے۔ بات بات پر بگڑ جاتی ہو۔ ابھی بلا وجہ مانو کو پیٹ دیا۔ نصیر سے نہ معلوم کیا کچھ کہہ ڈالا۔ خدا جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔"

قیصر نے پھندنے گننے کی کوشش ترک کر دی۔ احسن جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر شام کا اخبار پڑا تھا، اُسے اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ پھر اخبار رکھ کر اس نے سگریٹ سلگائی اور دیوار پر ٹنگے ہوئے کلنڈر پر نظریں جما کر کسی خیال میں محو ہو گیا۔

یکایک کمرے اور دروازوں اور کھڑکیوں کے پٹ دھڑ دھڑ کرنے لگے، قیصر نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "آندھی آ رہی ہے...۔"

احسن نے بھی باہر دیکھا۔ گرد اور غبار کا ایک گہرا بادل تیزی سے آسمان پر چھا رہا تھا۔ چیلوں اور کوؤں کی ایک فوج گرد و غبار کے بادل کے آگے تیز تیز اُڑ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کی پھنگیاں ایک طرف جھکنے لگی تھیں۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔

دیکھتے دیکھتے گرد و غبار کا طوفان سارے آسمان پر چھا گیا۔ دھول کھڑکیوں اور دروازوں کے راستے داخل ہو کر کمرے میں بھر گئی۔ قیصر نے کہا... "کھڑکیاں بند کر دو۔ کتنی دھول ہے۔"

احسن نے کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیئے تو کمرے میں بالکل اندھیرا ہو گیا۔ قیصر نے کہا۔ "بتی جلا دو۔"

احسن نے بتی جلا دی۔

"دوسری بھی۔ بہت اندھیرا ہے...۔"

احسن نے دوسری بتی بھی جلادی۔

"مانو کہاں ہے؟"

"ہال میں ہو گا۔۔۔"

"اُسے یہاں لے آؤ۔۔۔"

احسن اندر کا دروازہ کھول کر باہر گیا تو ہوا کے ایک تیز جھونکے نے کمرے میں گھس کر کئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیا۔ سنگھار میز پہ رکھی ہوئی تصیر کی تصویر بھی مُنہ کے بل گر پڑی۔ قیصرا اوندھی پڑی ہوئی تصویر کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ اُسے اٹھا کر ٹھیک سے رکھ دے۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔

احسن مانو کو گود میں اٹھائے کمرہ میں داخل ہوا۔ مانو نے "آندی آئی۔ آندی آئی" کی رٹ لگا رکھی تھی۔ احسن نے اُسے گود سے اتار کر دروازہ بند کیا اور آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مانو دوڑتا ہوا قیصر کے پاس گیا اور قیصر کی پلنگ سے لٹکی ہوئی ٹانگوں سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"امّی۔"

جواب میں قیصر نے مانو کی طرف دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔

"امّی۔ آندی آئی۔"

"ہاں بیٹے۔۔۔" کہہ کر قیصر اُس دنیا تھی، کو دیکھنے لگی جس سے مانو کھیل رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد آندھی کا زور کم ہوا تو احسن نے سوائے ایک کے ساری کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے۔ گرد و غبار آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔ ہوا کا زور بھی کم ہو رہا تھا۔ چیلوں اور کوؤں کی فوج نہ جانے کدھر نکل گئی تھی۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے پیڑوں کی پھنگیاں اب صرف جھوم رہی تھیں۔

بادلوں کی تہیں آسمان پہ سمٹنے لگیں۔ ہوا کا زور گھٹتے گھٹتے ختم ہو گیا۔ سڑک کے کنارے

لگے ہوئے پیڑ ساکت ہو گئے۔ اور بجلی کے پنجے نے اچانک لپک کر بادلوں کا منہ نوچ لیا۔ بادل غرّائے۔ بجلی کا پنجہ پھر لپکا۔ بادل پھر غرّائے۔ اور وہ ہاتھی، مانو کے ہاتھ سے چھوٹ کر قیصر کے پیروں کے پاس گر پڑا۔ اس نے سہم کر قیصر کی رانوں کے بیچ میں اپنا منہ چھپا لیا۔

"بارش ہو گی...." احسن نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی لگتا ہے۔" قیصر نے بادلوں کی طرف دیکھا۔

لیکن بجلی بادلوں کا سینہ چیرتی رہی۔ اور بادل چنگھاڑتے رہے پر بارش نہیں ہوئی۔

"کھانا تیار ہے جناب...." خانساماں نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا۔

احسن نے قیصر کی جانب دیکھا۔

"میں نہیں کھاؤں گی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

احسن نے خانساماں سے کہا۔ "ابھی ٹھہریئے بڑے میاں۔" اور جب خانساماں چلا گیا تو اس نے قیصر سے پوچھا۔ "کیسی طبیعت ہے...؟"

"ٹھیک ہے۔ مگر سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔ سوچتی ہوں اس وقت کھانا نہ کھاؤں..."

"تھوڑا سا کھا لو..."

قیصر چپ رہی۔

بغل والے کمرہ میں فون کی گھنٹی بجی۔

خانساماں نے کمرے میں آ کر کہا۔ "آپ کا فون ہے صاب..."

"میرا؟...." احسن نے پوچھا۔

"جی صاب۔"

احسن کمرہ سے باہر چلا گیا۔

مانو اب پھر ہاتھی سے کھیل رہا تھا۔ اور قیصر اپنی انگلیوں کے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔ بڑے انہماک سے۔ اور جب کوئی دو منٹ بعد احسن کمرے میں واپس آیا تو اس نے اسی طرح اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کس کا فون تھا؟"

قیصر نے لمحہ بھر احسن کے جواب کا انتظار کیا۔ پھر نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے احسن کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ اور نہ معلوم اسے وہاں ایسی کون سی تبدیلی نظر آئی۔ کہ اس کی دونوں آنکھیں رقیق اور بے چین استفہام سے چمک اُٹھیں۔

"ڈاکٹر صاحب کا فون تھا..." احسن کی آواز میں بھی وہی تبدیلی آگئی تھی جو اس کے چہرہ پہ چھائی ہوئی تھی۔ قیصر کی نظریں اب احسن کے ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔

"ہسپتال سے بول رہے تھے"

استفہام کی چمک قیصر کی آنکھوں میں شعلہ بن گئی۔ اس نے احسن کے ہونٹوں پہ سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا "اس وقت! ڈاکٹر صاحب اس وقت ہسپتال میں!..."

"ہاں۔ معلوم نہیں کیوں... وہ کہہ رہے تھے...." احسن رکا تو جیسے قیصر کی آنکھوں کے استفہام کو کسی نے انگاروں پر لٹا دیا۔ اور احسن نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا... "اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ نصیر کا۔ موٹر ٹکرا گئی۔"

قیصر کی نظریں احسن کے ہونٹوں پہ سے ہٹنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

مانو چلانے لگا... "تتا آئے ہیں، تتا آئے ہیں..."

احسن نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے.... بہت چوٹ آئی ہے"۔

مانو قیصر کی ٹانگیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھ رہا تھا... آنٹی امی۔ تتا آئے ہیں؟..."

احسن کہہ رہا تھا۔ "وہ کہہ رہے تھے اس کی حالت بہت خراب ہے..."
قیصر کی آنکھیں کہہ رہی تھیں.... تم کہہ کیوں نہیں دیتے کہ....
احسن کہہ رہا تھا... "شاید ہی بچے..."
مانو کہہ رہا تھا... "آئیں امی؟... آئیں امی؟...؟
باہر بجلی چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ مگر کمرے کے اندر خاموشی اتنی گہری اور بوجھل تھی کہ اس میں ایک ہلکی سی لہر بھی نہ پیدا ہو رہی تھی۔
پھر احسن نے کھڑے کھڑے جوتا پہنتے ہوئے کہا۔ "جلدی کرو۔"
مگر قیصر ویسے ہی بیٹھی رہی۔ اور گویا اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "کتنی بار منع کیا کہ شراب مت پیا کرو.... کتنی بار کہا کہ موٹر اتنی تیز مت چلایا کرو۔ شہر کی سڑکوں پر چالیس پچاس میل کی رفتار.... جیسے جو چیز بھی سامنے آئے اس سے ٹکرا جانے کو بے چین ہے...."
احسن جوتا پہن چکا تھا۔ اس نے کنجیوں کا گچھا جیب میں ڈالا کوٹ کاندھے پر اور قیصر کا بازو پکڑ کر اسے پلنگ پر سے اٹھانے لگا۔ قیصر نے پیر سینڈل میں ڈالے اور بغیر تسمے باندھے احسن کے ساتھ چل دی۔ مانو ان کے پیچھے تھا۔ "امی بی تلیں گے۔ امی بی تلیں گے۔" اس نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
احسن اور قیصر زینے پر کھلنے والے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔
احسن نے کہا... "ہم کام سے جا رہے ہیں بیٹے۔ ابھی آتے ہیں۔"
"نئیں۔ نئیں۔ امی بی تلیں گے..."
"ضد نہیں کرتے بیٹے..." اس نے مانو کو چمکارا۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ مگر قیصر اندر ہی کھڑی رہی۔
"رک کیوں گئیں۔" احسن نے واپس ہوتے ہوئے کہا۔

قیصر نے دروازے کا پٹ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ "تم جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"دیر مت کرو۔ چلنا ہے تو...."

قیصر نے دروازے کے پٹ کو اور زور سے پکڑ لیا۔ "تم جاؤ..."

احسن اس کی آواز کو بمشکل سن سکا۔ اس نے کوٹ سنبھالا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

قیصر نے اُسے پکارا... "سنو..."

احسن رک گیا۔

"زینے میں اندھیرا ہے۔ سنبھل کر اترنا..."

احسن پھر تیزی سے سیڑھیاں پار کرنے لگا۔

"اور سنو..." قیصر دروازے سے باہر آگئی۔ "بارش شروع ہو گئی ہے۔ موٹر تیز مت چلانا..."

احسن پہلا زینہ طے کر چکا تھا۔

"اور مجھے فون کر دینا..." قیصر کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ احسن اگر اس کے پاس کھڑا ہوتا تب بھی نہ سن پاتا۔

احسن کے قدموں کی آواز اب وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی جہاں قیصر دیوار سے سر ٹکائے کھڑی تھی۔ مانو بھی باہر آگیا تھا۔ اور قیصر کے چہرہ کی طرف دیکھ دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ "امی لوٹی ہیں۔ امی لوٹی ہیں..."

باہر اب نہ بجلی چمک رہی تھی اور نہ بادل گرج رہے تھے۔ مگر بارش کا زور دم بدم بڑھ رہا تھا۔

چاندنی اور اندھیرا

کراچی ۱۹۵۲ء

نقوش ۔ لاہور

زینے کے پاس کھڑے ہو کر میں نے دو بار ـــــ پہلے آہستہ اور پھر زور سے ـــــ رحیمن کو آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ نفیس اپنے خط میں لکھ چکی تھی کہ اس کے شوہر کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ مگر پھر بھی لمحہ بھر کے لئے مجھے شبہ ہوا کہ شاید وہ واپس آ گیا ہو۔

زینے پر قدم رکھنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اوپر کی طرف دیکھا اور میرے ذہن کو ایک دھچکا سا لگا اوپر زینے کے دوسرے سرے پر نفیس کھڑی تھی۔ سپید تنگ پاجامہ، سپید کرتہ، سپید دوپٹہ اس کے بھرے بھرے جسم پر بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر وہ چمک نہ تھی۔ جو مجھے دیکھ کر پیدا ہو جانی چاہیئے تھی۔

شام ہو چلی تھی اوپر اندھیرا سا تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔

لیکن مجھے دیکھنے کے بعد بھی وہ وہیں چپ چاپ کھڑی رہی! میرے ذہن کو ایک بار پھر دھچکا لگا۔ مجھے خط لکھ کر بلوایا۔ میں نے پندرہ دن کی چھٹی لی۔ اور اب جب یہاں پہنچ گیا تو میرے آنے کی ذرا سی خوشی بھی نہیں!

میرا خیال تھا کہ نفیس نہایت بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ مجھے دیکھتے ہی بے تاب ہو کر مجھ سے لپٹ جائے گی۔ کتنے اصرار سے بلایا تھا کہ خط کے ملتے ہی کم از کم پندرہ دن کی چھٹی لے کر چلے آؤ۔ پہلی گاڑی سے روانہ ہو جانا۔ دیر نہ کرنا۔

تمہیں میرے سر کی قسم۔ ان کا تبادلہ ہو گیا ہے، مگر میں ابھی یہیں رکوں گی۔۔۔۔۔ میں بالکل اکیلی ہوں، موقعہ اچھا ہے۔ وہ آ کر لے گئے تو نہ معلوم پھر کب ملاقات ہو، کب دل کی لگی بجھے۔ تم سے جُدا ہوئے صرف دو مہینے ہوئے ہیں مگر ایسا لگتا ہے کہ جیسے دو سال بیت گئے۔ ہر وقت تمہاری یاد ستاتی ہے۔ جلد آؤ۔ تمہاری نفیس بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔۔۔۔۔

اور اب نفیس۔۔۔۔۔ بہت ممکن ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا اُوپر پہنچ گیا۔ وہ میری طرف بڑھی اور میں نے اُسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

"آپ کا خط ملتے ہی کھنچا چلا آیا۔۔۔۔" میں نے نفیس کے جسم کے گرد اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ٹھیک کہا تھا رحیمن سے۔ بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ بلائیں اور میں نہ آؤں۔"

نفیس نے اپنے خط میں اس بات کا ذکر کیا تھا۔ رحیمن کہتی ہے تم نہیں آؤ گے۔ کہتی ہے تم بڑے مطلبی ہو۔ بہت منہ چڑھ گئی ہے۔ رازدار جو ٹھہری۔۔۔۔

میں نے نفیس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "رحیمن کہاں گئی۔ میں نے نیچے سے اسے کئی بار آواز دی۔۔۔۔"

نفیس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میرے سینے میں مُنہ چھپائے خاموش کھڑی تھی۔ مجھے پھر احساس ہوا کہ میری گرم جوشی کا نفیس کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔

میں نے اُسے کاندھوں سے پکڑ کر اپنے جسم سے الگ کیا۔۔۔۔ "آپ کو میرے آنے کی خوشی نہیں ہے؟"

اب میں نے پہلی بار غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس پر ایک زردی پھیلی ہوئی تھی۔ جس میں خوف۔ سراسیمگی اور بے چارگی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں کے گوشوں میں نمی سی

تھی۔ جیسے روئی ہو یا رونے والی ہو۔

"کیا بات ہے؟"

اس کے ہونٹ کپکپائے اور جواب میں اس نے صرف "منّا" کہا۔

منّا؟ .... ابھی پرسوں نفیس نے خط میں لکھا تھا۔ منّا اچھا ہے، تمہیں بہت یاد کرتا ہے...

"کیا ہو گیا منّے کو؟ .... کیا ہوا اُسے؟"

"صبح تک اچھا بھلا تھا محلّے کے لڑکوں کے ساتھ گلی میں کھیلتا رہا۔ لیکن دوپہر کو گھر لوٹا تو نہ معلوم اُسے یکایک کیا ہو گیا۔ آنکھیں چڑھ گئیں۔ دانتی بھینچ گئی اور سارا جسم اکڑ گیا۔ نہ بولتا ہے نہ کسی کی طرف ٹھیک سے دیکھتا ہے۔ رحیمن کہتی ہے کوئی نجس ہوا لگ گئی۔ ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ مگر وہ بھی نہیں سمجھ پایا کہ مرض کیا ہے۔ دوا دے گیا۔ انجکشن بھی لگا گیا۔ لیکن ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہوا، میں نے رحیمن کو انہیں خبر کرنے بھیج دیا ہے۔ کل صبح تڑکے وہ انہیں لے کر آجائے گی۔"

میں نفیس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو جس چیز پر سب سے پہلے میری نظر پڑی وہ ایک قرآن تھا جو کھڑکی کے پاس بچھی ہوئی میز پر کھلا رکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ابھی ابھی تلاوت کر کے اٹھا ہے کمرے میں دو پلنگ تھے ایک دائیں ہاتھ کی دیوار سے لگا بچھا تھا، اور دوسرا بائیں ہاتھ کی دیوار کے قریب۔ دائیں ہاتھ کے پلنگ کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی جس پر دوائیوں کی دو ایک شیشیاں پانی کا ایک گلاس۔ ایک چمچہ اور ایک چائے کی پیالی رکھی تھی۔

میز کے پاس بچھے ہوئے پلنگ پر منّا لیٹا تھا۔ اس کا نچلا جسم ایک سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور سر پر کسی دوا میں بھیگی ہوئی کپڑے کی ایک پٹی رکھی تھی۔

میں نے پلنگ کے پاس جا کر آہستہ سے آواز دی ــــ "منّے۔"

منّے کے جسم نے ایک ہلکی سی جنبش کی۔ اس کا چہرہ جو قدرے دیوار کی سمت تھا۔ ذرا سا میری جانب مڑا اور پھر یکایک جیسے کسی مضبوط ہاتھ نے اس کے جسم کے ہر حصّے کو ایسے مروڑ ڈالا گویا اس میں ہڈیاں تھی ہی نہیں۔ اس کا سارا بدن اکڑ گیا۔ منہ سے جھاگ بہنے لگا اور پتھرائی ہوئی آنکھیں چھت کے اس گوشے کی طرف مڑ گئیں جس میں ایک مکڑی تیزی سے جالا بُن رہی تھی۔

"یہ چوتھا دورہ ہے" نفیس نے کہا۔

دورے کا زور کم ہوا تو دوا کا وقت ہو چکا تھا۔ نفیس نے دوا کی شیشی اور چمچہ میری طرف بڑھا دیا۔ بڑی مشکل سے دوا کے چند قطرے منّے کے حلق سے نیچے اُترے۔ اس کے دانت اتنی سختی سے بھنچے ہوئے تھے کہ انھیں کھولنے کی کوشش میں میری اُنگلی اس بُری طرح دبی کہ خون چھلک آیا۔ پھر میں نے چمچے کے دستے سے اس کے منہ کو ذرا سا کھول کر اس میں دوا انڈیل دی۔ تھوڑی سی بہہ کر باہر آ گئی اور باقی خرخراہٹ پیدا کرتی ہوئی نیچے اُتر گئی۔

تھوڑی دیر بعد منّے پر غنودگی طاری ہو گئی تو نفیس پلنگ پر سے اُتر کر آرام کرسی پر آ گئی۔ سراسیمگی اور ہراس کی وہ نہایت باریک نقاب جو اس کے چہرے پر پڑی ہوئی تھی۔ یا تو آہستہ آہستہ سرکنے لگی یا شام کی سیاہی مائل روشنی اس پر غالب آ گئی۔ اس کے موٹے ہونٹوں کے کونے اب بھی لٹکے ہوئے تھے۔ بالوں کی چند لٹیں بکھری ہوئی تھیں، آنکھوں میں اشارے کرنے والی چمک نہ تھی لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پریشانی میں قدرے کمی ہو گئی ہے۔ اس کا سبب میری موجودگی تھی یا منّے کی غنودگی۔

"تمھیں میرا خط کب ملا؟"

"کل شام کو دفتر بند ہونے سے ذرا دیر پہلے۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

"چھٹی ملنے میں دقت تو نہیں ہوئی۔؟"

"نہیں تو۔۔۔۔"

"کتنے دن کی لی؟"

میں جواب دینے سے پہلے لمحہ بھر رُکا۔"بس تین دن کی ملی۔ ایک آنے میں نکل گیا دوسرا جانے میں گزر جائے گا۔"

نفیس ذرا دیر خاموش رہی، پھر آکر میرے پاس دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"میں نے لکھا تھا پندرہ دن کی چھٹی لینا۔۔۔"

جواب دینے سے پہلے میں نے پھر قدرے توقف کیا۔"دفتر میں کام بہت ہے بڑی مشکل سے تین دن کی منظوری ملی، بڑے صاحب نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ تو چھوٹے صاحب نے سفارش کر دی ورنہ۔۔۔"

نفیس چپ رہی۔ میں کھسک کر اس کے پاس آگیا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"سچ کہتا ہوں بڑی مشکل سے ملی چھٹی۔ کئی لوگوں کی عرضیاں بہت پہلے پڑی تھیں مجھے تو ذرا بھی اُمید۔۔۔"

"تو تم کل چلے جاؤ گے؟" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

میں کہنا چاہتا تھا "ہاں" مگر خاموش رہا۔

"کل صبح وہ بھی آجائیں گے۔۔۔" نفیس نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ منے کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ اللہ کرے اُس کی طبیعت اچھی ہو جائے۔"

سورج کوئی دم میں ڈوبنے والا تھا۔

منّے کے بدن نے جنبش کی۔ میں نے اپنا ہاتھ نفیس کی کمر کے گرد سے ہٹا لیا۔ منّے نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی اور ایک چیخ اس کے منہ سے اس زور سے نکلی کہ نفیس کا وہ ہاتھ جو میرے ہاتھ میں تھا کانپ اٹھا۔ میں اور نفیس لپک کر اس کے پاس گئے اس پر پھر دورہ پڑ گیا تھا۔ پھر بدن اکڑ گیا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ میں سرہانے بیٹھ گیا اور میں نے اس کا سر اٹھا کر اپنے گھٹنے پر رکھ لیا۔ نفیس اس کے تلوے سہلانے لگی۔ اسی حالت میں تھوڑی دیر بعد اس نے ایک چھوٹی سی قے کی جس میں خون کی کافی مقدار تھی۔ خون دیکھ کر نفیس کے چہرے پر پھر خوف اور گھبراہٹ کا غبار چھا گیا۔

قے کے بعد منّے کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئیں۔ اور اس نے پہلی بار میری طرف ایسے دیکھا گویا مجھے پہچانتا ہو۔

"اب اس کی طبیعت سنبھل جائے گی"

مگر نفیس صرف ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

"شاید دوا کا اثر ہے۔"

وہ چپ رہی۔

میں چاہتا تھا کہ منّے کا سر اپنے گھٹنے سے ہٹا کر تکیئے پر رکھ دوں مگر جونہی میں نے اس کے سر کو اٹھایا خرخراہٹ کی ایک مدھم مگر مسلسل آواز اس کے حلق سے نکلنا شروع ہوئی۔ میں نے اس کے سر کو پھر اپنے گھٹنے پر رکھ لیا۔ نفیس سرک کر میرے پاس آ گئی۔ اور منّے کے چہرے پر جھک کر خرخراہٹ کی آواز سننے لگی جو آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ مگر آواز یکایک پھر مدھم ہونے لگی، منّے کی آنکھوں میں پھر گھبراہٹ اور تکلیف کے آثار دکھائی دیئے جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ پھر اس نے ہچکیاں

ہیں۔ایک۔دو۔تین۔ اور اس کا سر میرے گھٹنے پر سے لڑھک گیا۔

منّے کی موت کو لگ بھگ چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔

میں آرام کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ نفیس سپید چادر سے ڈھکی ہوئی نعش کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔

کمرے میں اب نہ رونے کی صدا گونج رہی تھی اور نہ چیخنے اور کراہنے کی آواز۔ نفیس کی آنکھیں۔اب بھی سُرخ تھیں اور قدرے سوجی ہوئی بھی۔مگر نم نہیں۔ آنسو خشک ہو چکے تھے۔حالانکہ اس کے بھرے بھرے گالوں پر ان کے نشانات ابھی تک نمایاں تھے۔بال اب بھی بکھرے ہوئے تھے مگر دوپٹہ کسی قدر سلیقے سے نصف سر پر اور نصف کاندھے پر پڑا ہوا تھا۔

کمرے میں چھائی ہوئی بوجھل خاموشی کے سینے میں دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی کی ٹِک ٹِک کبھی بلند ہو جاتی اور کبھی مدھم۔

کمرے میں اندھیرا تھا اور لوبان کی خوشبو ابھی تک فضا میں بسی ہوئی تھی۔

گھڑی نے گھنٹہ بجایا۔

"تم اب جا کر سو جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "مجھے نیند نہیں آرہی۔"

ذرا دیر چُپ رہ کر اس نے پوچھا۔ "تم کل ضرور چلے جاؤ گے؟"

اس بار میں نے کہہ دیا "ہاں"

"گاڑی کس وقت جاتی ہے؟"

"آٹھ بجے، صبح۔"

"آٹھ بجے۔!"

"وہ کب تک پہنچ جائیں گے؟"

"ان کی گاڑی چھ بجے کے قریب آتی ہے۔"

"تو میں یہاں سے چھ بجے سے پہلے چلا جاؤں گا۔"

"تم اب جا کر سو جاؤ۔" اس نے ایسے کہا جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔

مگر میں نے نہ جواب دیا اور نہ جا کر پلنگ پر لیٹا۔ نفیس پلنگ پر سے اٹھ کر میرے پاس آئی۔۔۔ "چلو چل کر لیٹ جاؤ۔"

"مجھے سچ مچ نیند نہیں آ رہی۔"

"چلو۔۔۔ چلو۔۔۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کرسی پر سے اٹھانے کی کوشش کی۔

"خدا کی قسم مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی۔"

مگر اس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

"بلکہ آپ تھوڑی دیر سو جائیے۔ کتنی تھک گئی ہیں۔"

لیکن نفیس نہ مانی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوسرے پلنگ تک لے گئی۔ میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ لمحہ دو لمحہ میرے پاس کھڑی رہی پھر یکایک جا کر آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ جیسے اس نے کوئی ارادہ بدل دیا ہو۔

میں دس منٹ پلنگ پر بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا، حالانکہ مجھے نیند قطعاً نہیں آ رہی تھی۔ دس منٹ اور گزر گئے۔ میں نے کروٹ بدلی۔ پلنگ چرچرایا۔

"تم جاگ رہے ہو"؟

"میں نے کہا تھا مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

"وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گئی۔

"کل تمہارا جانا ضروری ہے؟"

"جانا ہی پڑے گا۔ چھٹی جو ختم ہو جائے گی۔"

پھر ذرا رک کر "اور کل صبح وہ بھی آ جائیں گے۔"

"ہاں ...." وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تم ہوٹل میں ٹھہر جانا۔ جس میں پچھلی مرتبہ رُکے تھے خرچ میں دے دوں گی۔"

(شروع شروع میں جب وہ مجھے روپے دیتی تھی تو مجھے شرم آتی تھی)

"نہیں خرچ کی کوئی بات نہیں ... مگر ... میری چھٹی ...."

"تار دے کر بڑھوا لینا۔"

میں چُپ رہا تو نفیس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور اُسے آہستہ آہستہ غیر ارادی طور پر دبانے لگی۔ یہ وہ اکثر کیا کرتی تھی۔ پھر وہ کھسک کر میرے اور قریب آگئی اور میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"تم ناراض ہو گئے؟"

"ناراض؟ .... کیسی باتیں کرتی ہیں آپ! ناراض کیوں ہوں گا! ناراضی کی کیا بات ہے؟"

"تو پھر میرے سر کی قسم چھٹی بڑھوا لو۔"

"مگر میں نے بتایا جو آپ کو کہ ...."

میری پوری بات سُنے بغیر وہ پلنگ پر سے اٹھی اور گلی میں کھُلنے والی کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی، اُس کا سر کھڑکی کے پٹ سے ٹکا ہوا تھا، اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جا کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ سر جھکائے۔ جیسے کسی خیال میں غرق ہو۔ دو چار منٹ بعد وہ پھر کھڑکی کے پاس گئی اور لکڑی کے چوکھٹے میں جڑی ہوئی سلاخوں کو پکڑ کر باہر جھانکنے لگی۔

میں نے کہنی کے بل اُٹھتے ہوئے کہا .... "آپ بھی تھوڑا آرام کر لیجیے، تھک گئی ہیں۔ ذرا دیر لیٹ ہی جائیے۔"

"ہوں ...." اُس نے سلاخیں چھوڑ کر میری طرف مڑتے ہوئے کہا ... "نہیں۔

تم لیٹے رہو۔"

میں پھر لیٹ گیا۔ وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گئی اور میرے ہاتھ کو آہستہ آہستہ دبانے لگی۔ میں نے ایک بار پھر اس سے لیٹنے کو کہا۔ اس مرتبہ اس نے کچھ کہا تو نہیں مگر تکیہ کی طرف ایسے جھکی جیسے لیٹنا چاہتی ہو۔ میں کھسک کر ایک طرف ہو گیا۔

ہمیں ساتھ ساتھ لیٹے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ نفیس نے کروٹ بدلی اور میرا وہ ہاتھ جس کی ایک انگلی منّے کے دانتوں کے بیچ میں آ کر کٹ گئی تھی۔ نفیس کے کولھے سے دب گئی۔ ایک تیز "سی" میرے حلق تک آ کر رک گئی۔ کٹی ہوئی انگلی میں درد ہو رہا تھا۔ شاید خون بھی نکل آیا تھا۔

نفیس اب کروٹ کے بل لیٹی تھی اور میں چت۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ اس کا سانس میرے چہرے پہ گر رہا تھا۔ اس کا سینہ میری بغل سے لگ رہا تھا اور اس کی ٹانگیں میری ٹانگوں کو چھو رہی تھیں۔

پھر اس نے اپنا ہاتھ میری کمر کے گرد ڈال کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں کو تلاش کرنے لگے۔

میں چند لمحے نفیس کے گداز سینے سے لگا لیٹا رہا۔ پھر میں نے انتہائی آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنی پشت پہ سے ہٹایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ اور میں جا کر آرام کرسی پہ بیٹھ گیا۔

میری انگلی ابھی تک دکھ رہی تھی اور میرا سانس قدرے تیز چل رہا تھا۔

میں نے پاس والے پلنگ پر نظر ڈالی۔ کھڑکی میں سے آتی ہوئی چاندنی زیادہ تر سپید چادر سے ڈھکی ہوئی نعش پہ اور تھوڑی سی سامنے والی میز پہ رکھے ہوئے قرآن پہ پڑ رہی تھی۔

میں نے جھجکتے ہوئے دوسرے پلنگ کی طرف دیکھا جس پر نفیس لیٹی ہوئی تھی، وہاں اندھیرا تھا۔
میں جہاں بیٹھا تھا وہاں بھی اندھیرا تھا۔